

ایاز

نیل کنڈھ اور نیم کے پتے



دانیال

بی بی کنڈھ اور نیم کے پتے



نیل کنٹھا اور نیم کے پتے



نیل کنڈھا اور نیم کے پتے

شیخ ایاز

دانیال

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار : ۱۹۸۸ء
ناشر : حوری نورانی
مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر
عبد اللہ ہارون روڈ کراچی
طابع : احمد سادرس - ناظم آباد - کراچی
قیمت : Rs. 65-00

سروِ حق کی پینٹنگ کے لئے ہم مشہور و معروف جناب لے آؤنا گوری کے مشکور ہیں۔

مستمر مرزا اور مرحب قاسمی کے نام

ترتیب

- ۱۷ دل یزداں نے کہا، ایک خزانہ ہوں میں
۱۹ سراپوں میں کھوئے ہوئے آہوانِ رمیدہ
۲۱ پھول جھڑتے ہیں
۲۲ مری طرح کی راگنی سن رہے ہو
۲۳ میں ہرن اور تو مری ہرنی
۲۴ آرزوئیں سچا ریوں کی طرح
۲۵ میں نے انسان کے دل میں جھانکا
۲۶ یہ انسان
۲۷ ترپتی ہوئی بجلی کی طرح
۲۸ تیرے ہونٹوں سے میں نے پی تھی مے
۲۹ پریشاں خیالوں !
۳۰ زندگی ایک تصویر کی فوس سازی ہے
۳۱ میں ہوں اک تنہا راہی
۳۲ کسی پھول سے پریت نہ کرنا
۳۳ اگر تو قریب تھی
۳۴ میں نے جب محفلِ انجم کو بکھرتے دیکھا
۳۵ مسکدے کو جگلاؤ
۳۶ میں نے دیکھا ہے اسے
۳۷ کچھ ویراں میں اکیلا بیٹھ کر
۳۸ کھلتا پھول کنول کا
۳۹ شفق میں کبھی سایہ پر فشاں قاز کا
۴۰ ہانکو
۴۱ قطعات
۴۲ نین کنول مڑ جائے
۴۳ کہاں سے اڑ کے آیا بچھی

۵۶	میں میں ہمیکہ ملارکوی کی آنکھوں میں برسات
۵۷	جب جھرنے میں چاند نہائے
۵۸	رات کروٹ بدل رہی ہے دیکھ
۶۰	آج مست مئے وصال ہیں ہم
۶۱	دیکھ منزل بگفت غبار آلود
۶۲	رنگ و بو کا غبار ہوتے تھے
۶۳	ہائے میں کون ہوں کہاں ہوں میں
۶۵	ہر زمانے میں پھول کھلتے ہیں
۶۶	پھول توڑے تھے کچھ بہاروں میں
۶۸	سارے قصے تمام کر دیتے
۶۹	زینت کے جام اہی میں روز و شب
۷۰	نہن بروں سے سر رگزر ملتے ہیں
۷۱	آتی ہے یاد صورت جاناں کبھی کبھی
۷۲	دل افسردہ کی تمنائیں
۷۳	صبح دم جب ہم چین میں آگئے
۷۴	جلد آجا کر رات ہوتی ہے
۷۶	ساز ہستی کی جیت میں ہم لوگ
۷۷	پھول پر پر تو خزاں سا ہے
۷۸	حاصل جستجوئے پیہم کیا
۷۹	میکدے میں ترا مہینوں سے
۸۱	آلچنے لگیں مشعلیں آندھیوں سے
۸۲	تخلیق فن
۸۵	آرزوؤں کے پھول چن لینا
۸۶	سچل سرمست
۸۷	سچل سرمست

۸۸	سچل سر مست
۹۰	سچل سر مست
۹۲	چین رائے سآمی
۹۳	سآمی
۹۵	سآمی
۹۷	سآمی
۹۸	سآمی
۹۹	سآمی
۱۰۱	میر عبدالحسین ساآگی
۱۰۳	بادلوں کی طرح طوفانوں کی زد میں
۱۰۵	اے سوال پر خطر
۱۰۶	قبرستانِ مکی میں
۱۰۸	اے خریدارِ حقیقت
۱۰۹	سندھ صدیوں سے
۱۱۱	اے بھٹائی
۱۱۵	اے تصنیع کے امین !
۱۱۶	آج بھر پڑوا چلی
۱۱۸	تجھ سے دُور کدم کے اوپر
۱۲۱	بھور بھتی اور بچھی جا گئے
۱۲۳	دُور کیلاش سے
۱۲۵	میری بچی مسکراتی انکھڑیوں سے
۱۲۷	بھور ہوتی ہے
۱۲۹	قحبہ دور کہن
۱۳۱	عشق میں نے بھی کیا ہے یارو

۱۳۳	قرضِ منصور
۱۳۴	آج کتنی گرم کو چلنے لگی
۱۳۵	اے معری
۱۳۶	پھر سے اورنگ زیب اور خوشحال خاں
۱۳۷	اب تک میرے من میں کبیرا پیت کا دھاگا کا تہا ہے
۱۳۸	منش وہی ہے
۱۳۹	سندھ میرے وطن
۱۴۰	گوانا الحق تو نہیں کہتا ہوں میں
۱۴۱	قاضی القضاۃ نے
۱۴۲	لسل نو
۱۴۳	کوچہ بجاناں کی جانب جو گلی جاتی تھی اب سنان ہے
۱۴۴	اک خموشی قہرِ غم میں غوطہ زن
۱۴۵	کیا تم میرے ساتھ چلو گے
۱۴۶	گورے سانپ بلوں میں بھاگے
۱۴۷	بارشیں ہوں گی، زہر ہستی یہ تھم جائے گی دھول
۱۴۸	باز آیا میں ترے نروان سے شاکسہ مٹی
۱۴۹	اب تو سورج ڈھل رہا ہے
۱۵۰	خونِ انساں بہہ رہا تھا کل یہاں
۱۵۱	کیوں تم مجھ کو چھپا رہے ہو؟
۱۵۲	بے تحاشا صبح و شام
۱۵۳	وہ گرا دھم سے گرا
۱۵۴	تم کہتے ہو
۱۵۵	داہنِ آتشِ فشاں میں یہ جوا خانہ تو دیکھ
۱۵۶	خاک کو صبرِ سبز کرنے کے بغیر

۱۷۰

قوم نے تیری قدر نہ کی، یہ سوچتے ہو

۱۷۲

اے پرندو! انہیں بتاؤ کہ میں

۱۷۵

آج کیوں پھول لانے لگے

۱۷۷

بانہہ بٹنی سی تھی ہاتھ تھا پھول سا

۱۷۹

ساقِ سیمیں کسی نیم عریاں کئے

۱۸۰

پات جھڑنے لگے رُت بدلنے لگی

۱۸۱

جاننا ہوں کہ وہ وقت آئے گا

۱۸۲

جل رہے ہیں نگر

۱۸۴

میرے دیدہ ورو

۱۸۶

اُس کا دام نہ پوچھ اے آمر

۱۸۹

امیر خسرو پنہاری سے

۱۹۲

مکھ پر ڈالے کیس ابھا گن دھرتی جب سو جاتی ہے

۱۹۳

پرنگمال کے رہنے والو!

۱۹۶

اپنی سازِ صی کو یوں سیٹے ہوئے

۱۹۹

پھر آج اندھیری گلیوں میں

۲۰۱

پریم دیوانی میراں روئے

۲۰۳

لوگ کہیں میراں بھی بانوری

۲۰۵

ایک دیوانی کہ تیری کوئے دی

۲۰۶

عطیفت اور خسرو

۲۰۸

اس سمت بھٹائی گلیوں میں

۲۱۰

آنے والا کل دیکھو جب سرخ سویرا ہوگا

پیش لفظ

سندھی زبان میں سنہ ۱۹۷۱ء ایاز کی شاعری تیزی سے بڑھتے ہوئے طوفانی دریا کی طرح ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا یہ آرد و انتخاب ایسا ہے جیسے اسی دریا سے ایک نہر نکالی گئی ہے۔ اس نہر کے پانی میں ایاز کی شاعری کے خد و خال کی جھلکیاں نظر آسکتی ہیں گو اس شاعری کے پورے چہرے کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک نمونہ ”مشت از خردارے“ کے طور پر غیر سندھیوں کے لئے ایاز کی شاعری ہلکا سا تعارف ضرور ہے۔

ایاز کی شاعری کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ اپنے خطہ زمین سے پیارا اس کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف ایک تیز و تند احتجاج ان کی شاعری کے ایک بڑے حصے کا سرچشمہ رہا ہے اور اس احتجاج نے بھی سورتگ اختیار کئے ہیں، کہیں گہرا ڈکھ، کہیں بھڑکتا ہوا غصہ، کہیں کٹیلا طنز، زہر خند، تو کہیں تسلی بھری شفقت کے بول۔ غرض ایاز کی سندھ کے لئے شاعری بذات خود اپنے اندر ایک عالم رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی غیر سندھی کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہی اس خاص نوعیت کی شاعری کی عظمت کی پہچان ہے۔ اسے پڑھنا ایک غیر سندھی کو بھی سندھی بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ایاز کی شاعری تسلی نفرت یا تعصب بالکل پاک ہے۔ پھر بھی سندھ کے لئے ایک گونجا ہوا نغمہ نعرہ ہے۔ سندھ کے مخصوص حالات لیے رہے ہیں کہ سندھ ان کی شاعری کا پیڑ ہے۔ گنتی چھاؤں دینے کے باوجود اس کے پتوں میں کرواہٹ ہے۔ (مگر اس کا پکا پھل پھر بھی میٹھا ہے اور خون صاف کر سکتا ہے) اور اس نیم پرنیل کنٹھ خود شیخ ایاز ہیں۔ ایک رنگ برنگ پرندہ جس نے زہر کا گھونٹ بھرا ہے۔ جو اس کے گلے پر نیلی دھاری بن گیا ہے وہ ایک شاعر تلخ خواہن ہو سکتا ہے اور کبھی کبھی ہنسنا ہے۔ ان کے نئے مجموعہ کلام کی ایک نظم پڑھ کر میں سارا دل ہنسنے لگی رہی۔ آپ کے لئے ترجمہ کرتی ہوں۔

فارشی فوج کی شکست

دیکھیے کتنے رسالے آرہے ہیں
کس قدر کرتے تھے بڑبڑ
کس قدر کرتے تھے "اکڑ"

مورکھائی کے نوالے آرہے ہیں
یہ یہ کل تک ہمار اپنی
یاد رکھ پائیں گے یہ کیا مار اپنی
کس قدر مایوس رسالے آرہے ہیں

تو اس طرح ایاز کا ایک باکپن ہے۔ وہ روایتی شاعر نہیں ہیں جس طرح یگانہ روایتی شاعر
نہ تھے لیکن یگانہ صفت بانگے تھے۔ ایاز کی شاعری کے پہلو متعدد ہیں ایاز کی حسیت پسندی
اور ان کے ساتھ روحانیت کی طرف ان کا رجحان۔ یہ بھی شاعر کی زندگی بھر کی کشمکش کا آغاز
ہے۔ یہ گویا اس بافتہ کا نانا بنا ہے جس نے بڑے خوبصورت، دلآویز نقش و نگار بنائے ہیں۔
ایاز کا تخیل کتنا خوبصورت ہے اور وہ کتنی سادگی اور پُرکاری سے اپنی بات کہتے ہیں۔
اس کی ایک مثال ان کی ہمیشہ یاد رہ جانے والی نظم "دور کی تلاش سے" میں ملتی ہے۔

دور کی تلاش سے، چاند ہمینت کا
میرے من کو ہمیشہ بلاتا رہا
میں کہ دن میر تھا

برچھ کی چھاؤں میں، میں نہ بیٹھا کبھی
بیرپوں نے کبھی یہ شکایت نہ کی
میں نے لڑتے ہوئے وار ادھے کئے

مارنے سے کبھی ہچکچاہٹ نہ تھی
 اور نہ مرنے کا ڈر
 رن کی جلتی ہوئی ریت پر، ہاں مگر
 دور کی لاش سے
 چاند ہمیں نہ کا
 میرے من کو ہمیشہ بلا تارما

اس نظم میں ایاز نے خود اپنی شاعری پر جیسے ایک حسین اور بھرپور تبصرہ کر دیا ہے۔ ایاز کی اس نظم کا میں نے بھی ترجمہ کیا تھا اور سارے وقت گنگناتی رہی تھی۔ شیخ ایاز کو شاعری کے پُر اسرار فن کا کوئی ناقابل بیان راز معلوم ہے۔ یہ تو سرا سر دین ہے۔ ان کی شاعری کے ساگر میں کئی دھارے آکر گرتے ہیں۔ ہندوستانی قدیم دیومالائی تصورات کی دھرتی سنگند سے بوجھل بوجھل سی مٹی، سندھ دھرتی کے اپنی مخصوص شعری ورثہ کا ستر تال اور آہنگ ہند ایرانی تصوف کی سرستی جدید انسان کا سیاسی اور سماجی شعور اور پھر ان سب پر مستزاد شیخ ایاز کے خالص اپنے ذاتی، تیکھے تیور۔ ان سب سے مل کر ان کی شاعری عبارت ہے۔ ایاز کا کلام پڑھ کر میں نے اکثر تعجب کیا ہے کہ آیا یہ فکر و فلسفہ کا ترجمہ ہے یا خود فنگلی اور ترجمہ گہرے غور و فکر میں غرق ہیں۔ ایسا سنگ کسی کسی ہی شاعر کے کلام میں نظر آتا ہے۔ خود ایاز نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا۔

آج کو دنیا کی پنگھٹ پر
 سرس وئی اور کالی نے
 ساتھ ساتھ، رس کا گھونٹ بھرا ہے
 یہ سنگم برسوں کے بعد ہوا ہے
 کوئی مہا کوئی جتنا ہے

شیخ ایاز۔ بلاشبہ ایک مہا کوئی ہیں۔ ان کے اہل مقام کو آج جو پاک و ہند برصغیر میں بہت کم لوگ جانتے ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ان کا تعلق اس برصغیر کے انتہائی کنارے کے ایک چھوٹے سے خطے سے ہے جس کی زبان اپنے علاقے تک محدود ہے ورنہ حقیقت تو

یہ ہے کہ آزادی کے بعد ایاز کے لوشے کا کوئی دوسرا شاعر ہندوستان یا پاکستان میں اس کے افق پر ابھی تک نمودار نہیں ہوا ہے۔

”نیل کنٹھ اور نیم کے پتے“ کی اشاعت غیر سندھیوں کے لئے اس وسیع اور ہمہ گیر کلام کا تعارف ہے۔ ایاز کے کلام کے ایک حصے کا ترجمہ میں نے بھی کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب کوئی دوسرا دل والا آئے اور اس ستارے پر کند اچھالے اور ایاز کے تمام کلام کو اردو میں منتقل کر دے۔

فہمیدہ ریاض
کراچی

(۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک)



دل یزداں نے کہا، ایک خزانہ ہوں میں
 کیوں نہ عالم پہ گہرِ پاش بنوں !
 پھر گل و لالہ و شبنم کو بکھیرا اُس نے
 سُرمئی چادرِ شب کو، مہ و انجم سے بتایا زرکار
 اور حنینِ جہاں کو، درِ دنداں بختے ۔
 اُسے معلوم نہ تھا

کہ گل و لالہ، جگر چاک بنیں گے اک دن
 اور یہ شبنم بسرِ اوقات کرے گی رو کر
 سرِ افلاک بھٹکتا ہی پھرے گا یہ چاند
 اور انجم کی جھپکتی ہوئی آنکھوں میں کبھی
 نیند ہوگی کہ نہیں

اُسے معلوم نہ تھا، ہائے کہ ہنستے ہوئے لب

کبھی بیچارگی و غم کو دُبا رکھیں گے
 دامنِ دل میں کئی اشک چھپا رکھیں گے



سراپوں میں کھوئے ہوئے آہوانِ رمیدہ
 کھڑے سوچتے ہیں
 حیاتِ گریزاں تلاشِ مسلسل
 سیمِ تشنگی، حاصلِ زندگانی
 یہ کیسا ستم ہے
 کٹی عمر اک جرعہ آب کی جستجو میں -
 کبھی ڈھلتا سورج
 مثالِ نگیں، خاتمِ ریگ میں جگمگا کر
 بلاتا ہے سوائے افقِ آن کے قلب و نظر کو
 دیارِ فلک سے کبھی ماہ و انجم
 انہیں بھیجتے ہیں سلامِ بستم
 بہ وقتِ طلوعِ سحر، بادِ صحرا

اڑا دیتی ہے رُوح کا ہر تذبذب
 مگر پھر وہی آفتابوں کے تیرو سناں
 اور سینہ فگاروں کی جلتی ہوئی داستاں
 تشنگی، جستجو، تیز نو، دشتِ ویراں
 سرابِ مسلسلِ حیاتِ گریزاں
 یہ کیسا ستم ہے
 کئی عمر اک جرعہ آب کی جستجو میں



پھول جھڑتے ہیں

چاند ڈھلتا ہے

یہ بدن ، یہ حرم ، یہ کعبہ پاک

کیوں بنایا گیا ہے قصرِ خاک

آرزوئیں برات کی مانند

زندگی کی حسین دُہن کو

موت کی سیج پر سُلاتی ہیں

زندگی کی حسین شہ راہیں

وادی تیرگی میں ملتی ہیں



مری روح کی راگنی سُن رہے ہو
 پُرانی سنی لے ہے پُرانے سے نغمے
 پُرانی سی مے ہے، پُرانے سے شیشے
 جنھیں میں چُرا لایا ہوں ساقیانِ ازل سے
 بصدِ زعمِ زاہد، بصدِ رنجِ ناصح
 پلاتا رہا ہوں نئے میکشوں کو
 کوئی کہہ دے یہ ساکنانِ چمن سے
 میں وہ پھول لایا ہوں چُن چُن کے بن سے
 جو صدیوں سے خوشبو دیئے جا رہے ہیں
 پرستش کے قابل وہ اصنام لایا ہوں میں
 جو کہ روحِ ابد میں تراشے گئے تھے
 مگر وہ جب نہیں کہاں، امتیازِ پرستش کہاں ہے ؟



میں ہرن اور تو مری ہرنی
 آرزوؤں کی تشنگی لے کر
 زندگی کے سراب میں ہر روز
 میں تری جستجو میں پھرتا ہوں
 تیرے ہونٹوں کو چوس کر ہی میں
 تشنگی سے نجات پاتا ہوں
 روحِ آبِ حیات پاتا ہوں



آرزوئیں پجاریوں کی طرح
 رُوح شاعر کے سونے مندر میں
 آج ناقوس سا بجاتی ہیں
 میری دیوی کا مَر مریں سا جسم
 میری یادوں میں رقص کرتا ہے



میں نے انساں کے دل میں جھانکا
 ایک چھوٹا سا کنواں
 جس میں عکسِ مہ و انجم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
 میں نے چلو میں لیا کچھ پانی
 اور بلائیں دو جہاں کی نظر آئیں مجھ کو



یہ انساں
 یہ مرغابیاں
 بہتے پانی پہ سایہ کناں
 پرفشاں
 جارہی ہے کہاں
 یہ فرازِ زمیں، وسعتِ آسماں
 یہ سہانا سماں
 کتنا پر کیفیت ہے یہ سفر
 کاش ہوتا نہ ان کے دلوں میں
 کہیں گاہ کے اک شکاری کا ڈر



ٹپتی ہوئی بجلیوں کی طرح
 معنی حسن کا شانہ قلب پر آگرے
 اور میں ایک سہا سا پنچھی
 اسے دیکھتا رہ گیا
 تب سے میرے لئے

یہ بہار و خزاں کچھ نہیں
 رنگ و بو کچھ نہیں، دانہ و آشیاں کچھ نہیں
 جو رصیاد یا شفقتِ باغباں کچھ نہیں
 بادلوں کی تہوں میں بھٹکتا ہوا
 ایک حیرت زدہ شوقِ وارفتہ ہوں میں



تیرے ہونٹوں سے میں نے پی تھی
 عمر بھر مستی و خمار رہا
 تیرے عارض سے چن لئے تھے پھول
 موت تک موسم بہار رہا



پریشان خیالو!

مرے حشر ساماں سوالو!

مجھے چھوڑ جاؤ کہ مجھ کو ذرا نیند آنے لگی ہے
کہ میرے پپوٹوں پہ انبار بے خوابیوں کے لڑھکنے لگے ہیں
مری کُتلاتی ہوئی رُوح اس زندگی کے قفس سے
گھڑی دو گھڑی کے لئے بھاگنا چاہتی ہے

پریشان خیالو!

مرے حشر ساماں سوالو!

کہاں جا رہے ہیں ستاروں کے یہ اُن گننت کارواں
یہ کسی نے نہ جانا

یہ مسحور راہی کہاں جا رہے ہیں؟

کسی منزل نور کی جستجو میں!

مگر یہ تو میرا فریبِ نظر ہے
 طلسمِ خیالِ بشر ہے
 یہاں منزلِ نور کوئی نہیں ہے
 ازل سے ابد تک کوئی جاوداں تیرگی بیچ و خم کھا رہی ہے
 یہ دُنیا، یہ آماجگاہِ تمنا
 کہاں جا رہی ہے ؟
 یہ رقصِ روز و شبِ نوکِ خنجر پہ یوں ناچتی جا رہی ہے
 کہ جیسے اُسے پہ لیتیں ہو گیا ہو
 کہ اب پاؤں چھلنی نہ ہوں گے
 یہ انساں کہ صیادِ روزِ ازل ہے
 کہ پھینکیں ہیں کرنوں پہ جس نے کندیں
 یہ تیار کرتا ہے ہر روز ایسے انوکھے قفس کو
 جسے توڑ دیتا ہے پَر پھڑپھڑا کر کوئی طائرِ نیمِ بسل
 نہ جانے مجھے کیوں لیتیں ہو گیا ہے

کہ انسان خود ایک صیدِ زبوں ہے
پریشاں خیالو!

مرے حشرِ سماں سوالو

نہ جانے مجھے کیوں لیتیں ہو گیا ہے

کہ یہ پکیرِ خاک اکھوں نقابِ زرفشاں بدلتا رہے گا

مگر رو سیاہی چھپے گی، نہ اُس کی

بجھا دو یہ تاروں کے قندیل

فانوسِ ماہِ درخشاں

تصویر کی اس جھللاتی ہوئی جھیل کو تیرگی میں چھپا دو

کہ یہ روشنی میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے

مجھے نیند سی آرہی ہے



زندگی ایک تصور کی فسون سادہی ہے
 جھلملاتی ہوئی جھیلوں میں تری غوطہ زنی
 تیرتے تیرتے افسوس تری دل شکنی
 تُو نے اے دوست جسے دُور سے ساحل سمجھا
 وہ تو اک موجِ بے رو کی شکوں بیزی ہے
 کہ تجھے غرق تہہ آب کرے گی اک دن
 تُو نے چاہا ہے چراغِ سرِ منزل بننا
 تجھے معلوم نہیں ہے، سرِ منزل کیا ہے
 تیری نظریں تو ہیں سوئے شفق لالہ فشاں
 اور پاؤں ہیں کہ تیزی سے بڑھے جاتے ہیں
 سرِ منزل تو ہے اے دوست فقط ایک نشیب
 کہ گرائے گا تجھے موت کے انگاروں پر

میں نے سیکھا، لبِ ساحل سے نظارہ کرنا
اور ہر منزلِ انساں سے کٹنا کرنا



میں ہوں اک تنہا راہی
 نگر نگر میں ڈگر ڈگر پہ بھٹک بھٹک کر آیا ہوں
 دھرتی یا آکاش پہ مجھ کو کہیں نہ آیا چین
 گزر گئے دن رین -

دھوپ بھی دیکھی چھاؤں بھی دیکھی
 میرے من کا اڑتا بچھی
 ڈال ڈال پہ کسی بسنت کی آس کا مارا پھرتا رہا
 میں ایک ہرن تھا وحشی سا
 اس جیون کے بن میں برسوں پیاس کا مارا پھرتا رہا
 کبھی کبھی میں نے پھولوں سے اپنی سچ سجائی تھی
 کبھی کبھی اک جوئے شیریں میری راہ میں آئی تھی

میں ہوں اک تنہا راہی
 نگر نگر میں ڈگر ڈگر پہ بھٹک بھٹک کر آیا ہوں
 دھرتی یا آکاش پہ مجھ کو کہیں نہ آیا چین
 گزر گئے دن رین -



کسی پھول سے پریت نہ کرنا

کسی پھول کو میت نہ کہنا

پھول سدا مر جھاجاتے ہیں

کانٹوں میں اُلجھا جاتے ہیں

کسی چاند سے پیار نہ کرنا

کسی چاند کو یار نہ کہنا

پہنچی ان کو کب پاتے ہیں

اُڑتے اُڑتے تھک جاتے ہیں



اگر تو قریں تھی
 تو خوشبو سے لپٹے اندھیرے
 مہکتے سویرے
 تری زلفِ برہم ترا روتے روشن
 مری رُوح آوارہ فطرت کو اپنی محبت میں بھینچے ہوئے تھا
 وہ دن تھے کہ تیری کمر، میری قوس قزح تھی۔
 مرادل ترا ابڑ پارہ
 مگر مجھ کو اُس سے شکایات سی تھیں
 جیا وریا کی حکایات سی تھیں
 یہ قوس قزح کیوں دلاویز رنگینیوں کو لٹاتی رہی ہے
 کہ ہر ابڑ پارے پر اُس کی محبت کی اک داستان سی رقم ہے
 ابھی دُور ہوں تم

مہکتی فضائیں ، چہکتی تمنا وہی ہے

یہ رنگینوں کا جہاں ہے

یہاں ایک قوسِ قزح تو نہیں ہے !

مجھے اب کسی سے شکایات کیسی

جیا و ریا کی حکایات کیسی

مگر گاہے گاہے

مرے دل میں اک تیرتا سا خیالِ گریزاں

خیالاتِ موج کو چیر کر بھاگتا ہے

کہ یہ ابر پارہ یہ قوسِ قزح کاش چاند اور ہالاجنے

اور دونوں دوبارہ گلے مل کے آوارگی بھول جائیں



میں نے جب محفلِ انجم کو بکھرتے دیکھا
شورشِ ہستی عالم کو نکھرتے دیکھا
جب دمِ صبح ستارے ڈوبے

اور اک نور کا سیلاب اُمد کر آیا
تو مرے دل پہ ترا خواب اُمد کر آیا
خوابِ جو رات مری رُوح کو اکساتا تھا
خواب وہ جس نے مٹائی تھی مری قیدِ حدود
میں تری لذتِ آغوش کو چھو سکتا تھا
اور اس ہستیِ دلہوز کی لاکھوں چنچیں
میں تری موجِ تبسم میں ڈبو سکتا تھا
کھل گئی آنکھ مری

جب کہ اک نور کا سیلاب اُٹھ کر آیا
 اور اس ہستی دلِ فز کی لاکھوں چنجیں
 چونک اُٹھی مری مانوس سماعت جن سے
 ہم زباں ہو کے یکا یک گونجیں
 زندگی ایک تبسم کی گراں یابی ہے



میکرے کو جگمگاؤ
 میکشانِ پیر کی ہے بے کھنہ پلاؤ
 کیف و مستی کے خداؤ
 لڑکھڑاؤ
 خوب گاہ

آج میں نے روحِ بادہ دیکھ لی ہے
 اک نگاہِ حسنِ سادہ دیکھ لی ہے



میں نے دیکھا ہے اسے
 کون کہتا ہے کہ وہ جلوۂ مستور مرا واہمہ ہے
 چاندنی راتوں کے احسانِ جمیل
 تم بتاؤ کہ وہ محبوبِ حسین
 میری آغوش میں کس طرح چل جاتا ہے
 موسمِ گل کی سلگتی شامو
 تم بتاؤ کہ مرا کا شانہ
 آتشِ گل سے دکھتا ہے جب
 بارشِ حسنِ دو عالم کی طرح
 حلقہٴ بوئے چمن سے وہ مرا پیکرِ ناز
 ہائے کس طرح مہکتے لب و رخسار لئے
 خلوتِ دل میں چلا آتا ہے

ہائے یہ دولت و ثروت کا تجارتی یہ ہجوم
 خونِ انسان کو چراغوں میں جلانے والا
 تیرگی اور بڑھانے والا
 کون سمجھائے اُسے جلوۂ مہتاب بھی ہے
 کون سمجھائے اُسے
 تیری آنکھوں سے ترا نور تری بیداری
 چھین ہی لے گی کبھی
 جو کہ ہو حاصل بینائیِ دل
 ایسا ایک خواب بھی ہے



کنج ویراں میں اکیلا بیٹھ کر
مئے کہاں کی چاندنی پیتا ہوں میں

یہ طلسم ہست و بود

آسمان نیلگوں

چاند تاروں کا فسوں

اک ازل کی کیف و مستی بخش دیتا ہے مجھے

اور میں

جھومتا گاتا ہوا

کیف برساتا ہوا

ساغر مہتاب کو تھامے ہوئے

آسمانوں میں چلا جاتا ہوں دور

اور بہ ہنگام سرور

کچھ خدا کو بھی پلا دیتا ہوں میں



کھلتا پھول کنول کا
نتھابچہ

ماں کی چھاتی سے چٹا ہے
پھول پہ پھول کھلا ہے
لیکن دونوں پھول ہیں جس کے
وہ بھونرا ہرجائی بھونرا
کیا جانیں
کس دیس گیا ہے



شفق میں کبھی سایہ پرفشاں قاز کا
تُو نے جوئے خراماں پہ دیکھا تو ہوگا
کبھی تُو نے سوچا تو ہوگا

نہ سایہ حقیقت نہ جوئے خراماں حقیقت
نہ سیلِ زمانہ حقیقت نہ انساں حقیقت
فقط ایک رو ہے فقط ایک پرواز سی ہے
چمکتا ہوا خم بہ خم ابر نیساں
یہ بارش میں بھیگی ہوئی روح انساں
سراسیمہ، حیراں

صدف در صدف خوابِ ہستی در افشاں
یہ ڈھلتا ہوا دن یہ سورج یہ پیالے

یہ شب خیز مئے یہ طرب ریز باتیں
 یہ مدہوش آنکھیں یہ تیرے شوالے
 جہاں دیپ بن کر جلی ہیں
 تری آرزوئیں

جہاں کھو گئی ہیں تری جستجوئیں
 یہ سرگوشیاں، خیمہ آرزو کی فنائیں
 یہ قلقل، یہ گلبانگِ مینا، یہ راتیں
 یہ جشن چراغاں، تری زندگی کا
 مہکتا ہوا پھول تیری خوشی کا
 چمکتا ہوا کیف، زندہ دلی کا!
 دمکتا ہوا رنگ تیرے لبوں کا

گلی شبِ نیم آلود سا ہے
 یہ چہرہ ترا چیت کی چاندنی میں دھلا ہے
 مگر غور سے دیکھ پیارے
 کہ ہر شے کفِ موج میں بلبلا ہے

(ہانگو)

رات بھر موجِ رواں پر ڈولتا
ایک چھوٹا سا دیا



سایہ مہتاب، چرخ نیلگوں
اور فضا میں پرقتاں و پُرسوں
اک پرندے کا جنوں



تیرگی نیم شب، مثلِ عیار
جس پہ سونے کی لکیر
ہے یہ کوئل کی پکار

یہ شب خاموش و فیراں، یہ ہوا
 اور ردائے تیرگی اوڑھے ہوئے
 ایک جھینگہ کی صدا



آج بادل چھٹ گئے
 اور کوئٹہ کی گہری تہہ میں چاند کا
 عکس لہراتا رہا



صبح دم گہوارہ موج صبا
 جب رک گیا
 خوشہ گندم کی آنکھیں کھل گئیں



یہ ہوا، یہ آسماں
یہ لبِ ساحل یہ ساون کا سماں
جل رہے ہیں کشتیوں میں کچھ دے
اڑ رہی ہیں روشنی کی تتلیاں



پھر گزشتہ رات خستہ تن خدا
میرے دروازے پر آکر رک گیا
اور میں سوتا رہا



گرچہ چمپا کی کلی
رات بھر سوئی رہی
شور شرانگیز تھا
صبح تک طوفانِ ہیبت خیز تھا



بحرِ ناپید اکنار
ریگِ ساحل پر کئی نقشِ قدم
ہے جنہیں موجِ بلا کا انتظار

قطعات

دشنہ ساز سینہ شب میں
 نالہ نے مثالِ سیلِ خوں
 آج پھر کوئی راہِ مشرب میں
 لوٹتا ہے متاعِ اہلِ جنوں

نشہ زبیت ماہِ تباب ^(۱۴) بہ کف
 لغزشِ عشق کہکشاں بہ قدم
 تو ہی کہہ دے کہ خاکِ پاکِ وجود
 کس طرح خوابِ خلد سے ہے کم

پھر کوئی بادۂ ازل لے کر ^(۱۵)
 کوزہ گر کی دکان پہ آتا ہے
 اور بڑی احتیاط سے چُن کر
 اپنے جامِ و سبوا اٹھاتا ہے



نین کنول مڑھائے

ساجن لوٹ نہ آئے

آشنا کی اگنی تو من میں دیپ پہ دیپ جلانے

سمنے پرانا پاپی جگ میں لاکھوں چاند بچھائے

ڈگر ڈگر بھٹکائے

ساجن لوٹ نہ آئے

کیا جانے میرے نینوں سے ننڈیا کون چرائے

کاش مجھے آکاش پہ ایسا اک تارا مل جائے

جو چاند کا دیس دکھائے

ساجن لوٹ نہ آئے

بیٹی رتیاں! آج جو مجھ کو میرا کل مل جائے

میں جیون کی ناؤ ڈبو دوں جو وہ مانجھی آئے

کون اُسے سمجھائے

ساجن لوٹ نہ آئے



کہاں سے اُڑ کے آیا پیچھی
 کہاں ہے اُس کا دلیں ؟
 نیل لگن میں اُڑنے والا دُور دور سے آیا
 کس نے اس پاپی نگری میں پیچھے میں بٹھلایا
 اک سندر سپنے میں دیکھی اُس نے جگ کی مایا
 سارا جیون بہتے پانی پر چندا کی چھایا
 ایسے سمنے میں کھو کر مورکھ بھولا اپنا سراپا
 کبھی کبھی چندا سے اس نے دور سے نہہ لگایا
 لیکن چاروں اور سلاخیں جب اُڑنے پر آیا
 کس نے اُس کی پتتا دیکھی اور پیچھے کو ڈھلایا
 بن پنکھ لگا اُڑنے پھر پیچھی
 گیا بدل کر بھیس -



من میں میگو ملاذ کوئی کی آنکھوں میں برسات

سارے جیون پر پھیلانا

اک سپنے کا تانا بانا

اسی لگن میں مگن مگن سارہتا ہے دن رات

ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا

اور تاروں سے باتیں کرنا

جانے کب تک جگ پہ رہے گی کالی کالی رات

بیٹھا ہے یہ آس لگائے

کب پھولوں کی دُہن آئے

کب اس پھولواری سے نکلے بھنوروں کی بارات



جب جھرنے میں چاند نہائے
 چاند پہ نیلا بادل چھائے
 کنول کنول اپنے نینوں میں کوئی بھید چھپائے
 رات پجارجن بن کر آئے
 دیپ پہ دیپ جلائے
 پانی میں آکاش سمائے
 نیم پہ پنچھی گائے -
 پانی اور آکاش پہ تیرا پر تو سا لہرائے
 میرے من کو ہولے ہولے جگ سندر تا گھائے
 میں لپٹوں مڑ جائے مجھ سے میں جھپٹوں اڑ جائے
 کوئی بھید نہ پائے تیرا کوئی بھید نہ پائے



رات کڑوٹ بدل رہی ہے دیکھ
تیری زلفوں میں ڈھل رہی ہے دیکھ

اور اک ساعِ خمار آ گئیں
زندگانی سنبھل رہی ہے دیکھ

یہ صراحیِ بادۂ ہی اکشر
تیرا نعم البدل رہی ہے دیکھ

خسِ گل میں کمی نہیں لیکن
زندگی خوں اُگل رہی ہے دیکھ

رنگ لائے گی کیا یہ روحِ عصر
کشت و خوں میں جو پل رہی ہے دیکھ

جامہ کوہ کن میں روح جبر
اک نئی چال چل رہی ہے دیکھ

ظلمتِ زلیلت سے اُلجھتا رہ
شمعِ تقدیر جل رہی ہے دیکھ

اک سحر کی تلاشِ پیہم میں
زندگی آنکھ مل رہی ہے دیکھ

پرچمِ عزم کو بلند کر اور
وہ مشیتِ سی ٹل رہی ہے دیکھ



آج مستِ مئے وصال ہیں ہم
 صدِ صنم خانہِ خیال ہیں ہم
 تار و پودِ حیاتِ انساں سے
 اک اُلجھتا ہوا سوال ہیں ہم
 ایک واما ندہ مُکراہٹ ہیں
 خستہ تن ہیں تباہ حال ہیں ہم
 ہر زمانے کی ناشناسی سے
 زخمِ خوردہ ہیں باکمال ہیں ہم
 حسرتِ آمیز ہے نگاہِ آیاز
 مچو نیرنگِ ماہِ وصال ہیں ہم



دیکھ منزل بہ کف غبار آلود
 چند راہی ہیں کارواں میں ہم
 اک فلک بوس عزم کی خاطر
 مل گئے مجمع جہاں میں ہم
 لہلہاتے چمن لبوں پہ لئے
 مسکراتے رہے خزاں میں ہم
 اکٹ مہکتا ہوا تسلسل ہیں
 تیزی زلفوں کی داستاں میں ہم
 رات بھر کھوئے کھوئے رہتے ہیں
 تیری یادوں کی کہکشاں میں ہم



رنگ و بو کا غبار ہوتے تھے

پا بہ جولاں بہار ہوتے تھے

ہائے وہ رات جب ترے گیسو

سانس میں مشکبار ہوتے تھے

ہائے وہ صبح جب ترے عارض

قاصدانِ بہار ہوتے تھے

ہائے جب گردِ محبت میں

آرزوں کے ہار ہوتے تھے

ملگنی چاندنی کے سایے میں

وقفِ صدا انتظار ہوتے تھے

آج مڑھا گیا ہے اپنا دل
 ہم خدائے بہار ہوتے تھے
 اب وہ آہنگِ قلبِ ایاز کہاں
 اک مچلتی رستار ہوتے تھے



ہائے میں کون ہوں کہاں ہوں میں
 اک تحیر بھری فغاں ہوں میں
 خوشہ چینانِ عیش پھرتے ہیں
 محوِ نیرنگِ گلستاں ہوں میں
 یوں تری آرزو مہسکتی ہے
 جیسے پھولوں کے درمیاں ہوں میں
 غم نہ کر اس جہانِ تیرہ میں
 چاندنی ! تیرا پاسباں ہوں میں
 اے اسیرانِ شبِ بغورِ سنو
 اس کی زلفوں کی داستاں ہوں میں



ہر زمانے میں پھول کھلتے ہیں
برنگ و بو کی کمی نہیں ہوتی

ایسی راتیں بھی کاٹ لی ہیں جب
چاندنی چاندنی نہیں ہوتی

کیسی مئے ہے یہ تلخیِ غم میں
آج کوئی کمی نہیں ہوتی

اے تبسم فروشِ محبوبہ
ہر لگن، دل لگی نہیں ہوتی

مکرِ یاراں پہ فرطِ حیرت سے
چشمِ غم میں نمی نہیں ہوتی

بجھ نہ جائیں اُمید کی شمعیں

تیرگی ختم ہی نہیں ہوتی

غم نہ کر جاں نثارِ حُسنِ گل

بکتِ جاناں تہی نہیں ہوتی

ذکرِ رخسارِ یار سے عاری

شاعری شاعری نہیں ہوتی



پھول توڑے تھے کچھ بہاروں میں

خاشِ نوکِ خارِ باقی ہے

اے مہکتے ہوئے لبوں آؤ

میرے ہونٹوں میں پیار باقی ہے

ہے قسم اُسِ مِلحِ چہرے کی

میرے دل میں نکھار باقی ہے

کاروانوں کو ڈھونڈتے والا

ایک اڑتا غبار باقی ہے

تم کو دیکھا، ہنسا، پر آنکھوں میں

اشکِ بے اختیار باقی ہے

اب وہ راتیں کہاں آیاں مگر

یادِ گیسوئے یار باقی ہے



سارے قصے تمام کر دیتے
 زندگی عنرق جام کر دیتے
 تیری زلفوں پہ مے چھڑکتے اور
 صبح ہوتے ہی شام کر دیتے
 تیرے ہونٹوں پہ منتقل اپنا
 جذبہ انتقام کر دیتے
 غمِ دُوراں کا مضحکہ اُڑتا
 غمِ جاناں کو عام کر دیتے
 اُن کی چلتی تو حضرتِ زاہد
 ہر تبسمِ حرام کر دیتے



زلیست کے جام تہی میں روز و شب
 یادہ اپنا اپنا بھر لیتے ہیں سب
 سن تو زاہد میں نے توبہ کی تھی جب
 چاندنی راتیں نہ تھیں جیسی کہ اب
 زندگانی کی غزل کے چند شعر
 تیری آنکھیں تیرے عارض تیرے لب
 بہر شاعر صد صحیفہ ایک چاند
 صد پیمبر اک سکوت نیم شب
 دے گئی کوئی شعرا زندگی
 اک مئے کہنہ مرے ہونٹوں کو جب
 میں غزل خوان ہو گیا پھر سے ایاز
 جھومنے گانے لگا شہر طرب



سمن بروں سے سر رہنگزار ملتے ہیں
 اگرچہ مثلِ نیم بہار ملتے ہیں
 نہیں ہے منزلِ آخرِ جہانِ آب و گل
 نہ سوچ دوست کہ ہم بار بار ملتے ہیں
 ہزار جبرِ زمانہ سہی مگر ہم لوگ
 کسی حسین سے بہ اختیار ملتے ہیں



آتی ہے یادِ صورتِ جانان کبھی کبھی
 ہوتا ہے میرا دل بھی گلستان کبھی کبھی
 اس کشتیِ شکستہ کو حسرت سے دیکھ کر
 آیا ہے یادِ منظرِ طوفان کبھی کبھی
 صورت بدل گئی ہے عینِ روزگار کی
 بکھری ہے یوں بھی زلفِ پریشان کبھی کبھی
 کتنی ہی راتیں میں نے بنائیں سدِ بہار
 آغوش میں رہا مہرِ تاباں کبھی کبھی
 بھٹکا رہا ہے ایازِ سربِ حیات میں
 اے دوستِ مثلِ چشمہٴ حیاں کبھی کبھی



دلِ افسردہ کی تمنائیں
 وہ سرا پا بہار کیا جانے
 جو گھٹاؤں کی روح پر گزری
 پسند پر ہسینہ گار کیا جانے
 تیرے قدموں کی بے نیازی کو
 سجدہ رگزار کیا جانے
 موجِ مئے پہ رواں ہے کشتیِ عمر
 حسنِ معصوم یار کیا جانے
 بادلوں کی اُڑان پر رونا
 ساکنِ شہر یار کیا جانے
 خلشِ حسرتِ گناہ پہ مری
 تیرا پروردگار کیا جانے



صبح دم جب ہم چمن میں آگئے
 مثلِ شبِ نمِ برگِ گلِ پر چھائے
 ہے ازل سے زندگی سا غریب و ش
 رند کیا کیا میسکدے چھلکائے
 جھک گئی جب وہ نگاہِ شرمگین
 ہم ترے حسنِ طلب کو پاگئے
 خاکِ پائے حسنِ بنِ کرمِ ایاز
 کائناتِ بے کراں پر چھائے



جلد آجا کہ رات ہوتی ہے
 ہر خوشی بے ثبات ہوتی ہے
 تیرے ہونٹوں کو دیکھ کر مجھ کو
 آرزوئے ثبات ہوتی ہے
 تیرے ہونٹوں میں بھینی بھینی سی
 بوئے آبِ حیات ہوتی ہے
 پھول جھڑتے ہیں منے چھلکتی ہے
 کیا تیری بات بات ہوتی ہے
 جو تری زلفت میں اُلجھتی ہے
 بس وہی رات رات ہوتی ہے

گوشہ خلوتِ محبت میں
وسعتِ کائنات ہوتی ہے

شاعری ایاز کیا کہنا
اُن کے ہونٹوں کی بات ہوتی ہے



سازِ ہستی کی جیت ہیں ہم لوگ
 اک محبت کا گیت ہیں ہم لوگ
 میرے آکاش کے دھنی دیکھو
 اپنی دھرتی کی میت ہیں ہم لوگ



بڑی پر کیف شب تھی ملگبی تھا چاند کا مکھڑا
 نہ جانے اس رہیں روزِ زنداں پہ کیا گزری
 تمہیں معلوم ہے تاریکی و تنہائی شب میں
 تمہاری کوک سے کوئل، دل انساں پہ کیا گزری



فطرتِ حُسن حُسنِ فطرت ہے
 چاندنی سی رتری طبعیت ہے



پھول پر پر تو خیزاں سا ہے
 تیرا محو خیال ہو حبا نا
 وہ شبِ ہجر میں بسا اوقات
 چاندنی کا و بال ہو حبا نا
 میری تقدیر کا تسلسل ہے
 تیری زلفوں کا جال ہو حبا نا
 اب یہ حالت ہے عشق پر مہینسا
 اور سرا پا خیال ہو حبا نا
 خاکِ پروانہ جُنوں کا ہائے
 دودِ شمعِ خیال ہو حبا نا



حاصل جستجوئے پیہم کیا
 منتہائے نجات کیا معلوم
 موحیہ خواب پر رواں ہیں ہم
 ابتداء ہے نہ انتہا معلوم
 پھول کھلتے ہیں تاکہ جھڑ جائیں
 مدغائے صبا خدا معلوم



میکدے میں ترا مہینوں سے
 چاندنی انتظار کرتی ہے
 عارضِ یار کو نظر میری
 کس نفاست سے پیار کرتی ہے
 ہر جگہ کوئی بوئے آوارہ
 جستجوئے بہار کرتی ہے
 تجھ کو میری تلاشِ حسنِ ازل
 کس عقیدت سے پیار کرتی ہے
 دیکھ یہ نرگسِ خمّارِ آلود
 پھر مجھے بادہ خوار کرتی ہے

دیکھ یہ موجِ عشقِ ساحلِ مست
 پھر مجھے ہم کنار کرتی ہے
 گردشِ جام کو تروتازہ
 گردشِ روزگار کرتی ہے



اُجھنے لگیں مشعلیں آندھیوں سے
 سلجھنے لگی کا کلِ شبِ رفیقو
 مگر جب رفیقو

سحر ہو گئی زندگی سو گئی
 عزم خیر شکن آہنی جان و تن
 پنجرہ خواب میں موم سے ہو گئے
 مشعلیں بجھ گئیں پاسباں سو گئے
 اور نوعِ بشر کو یقین ہو گیا ہے
 کہ نورِ سحر تا ابد یونہی رخشاں رہے گا۔
 مگر یہ تو دستورِ روزِ ازل ہے

شب و روز اک دوسرے کا تعاقب کریں گے
 رفیقو نئی مشعلیں ڈھونڈھ لاؤ

شبِ تیرہ و تارِ سوئے زمین پھر پر افشاں ہوتی ہے

تحلیق فن

پھر کوئی سنگ بدست آتا ہے
 خانہ شیشہ گراں کی جانب
 پھر کوئی نعرہ مستانہ بڑھا
 لرزش کوئے اماں کی جانب

پھر کوئی شبیم تخیل لئے
 چہرہ گل پہ مہکنے آیا
 پھر کوئی فطرتِ قندیل لئے
 صبح کا ذب میں دہکنے آیا

پھر کوئی گردن مینا پہ جھکا
 پھر لبِ جام کسی نے چومے
 پھر نہاں خانہ اَصنام کھلا
 پھر صنم زندہ ہوئے اور جھومے

پھر نگاہِ صنم افروز کوئی
 سینہ سنگ میں پیوست ہوئی
 پھر کوئی تشنگی صہبا ساز
 تہہ ساغر میں چھسکتی پہنچی

پھر جٹاؤں میں گھٹائیں جھومیں
 اور کوئی میکدہ بردوش آیا
 لبِ فردا پہ تبسم نکھرا
 جب کوئی مستِ مئے دوش آیا

متلاطم ہوئی وہ تاریکی
 جس کی گہرائی نہ ہوگی معلوم
 ماہ و انجم کے حروف زریں
 جس کی ہر موج پہ ہوں گے مرقوم



آرزوؤں کے پھول چن لینا
 قصہ ہائے بہار سن لینا
 اور مہکتی ہوئی فضاؤں میں
 سنتے سنتے مدام سو جانا
 ہے یہی اختتام سو جانا

سچل سرمست

وہی موج و تلاطم ہے وہی اپنا سفینہ ہے
 مسلسل ہے حیات اپنی نہ مرنے نہ جینے ہے
 دیارِ کفر و ایمان ہے سنبھل کر چل ارے ناداں
 یہاں تو فرطِ نفرت ہے یہاں تو شرطِ کینہ ہے
 ریائے زہد کیوں اس کے قریب آئے کہ میرا دل
 شرابِ زلیت میں ڈوبا ہوا اک آبگینہ ہے
 ترا حسنِ خمار آگیاں سرِ بازار لے آئے
 یہی اپنا سلیقہ یہی اپنا قرینہ ہے
 درو دیوارِ مسجد زاہدِ زنداں طلب کے ہیں
 مرا تو مہ بہ مہ انجم بہ انجم ایک زمینہ ہے
 سحر پھوٹی ریائے زہد پھر سے کو کو نکلا
 سچو اب تک مری آنکھوں میں کیوں خوابِ شبینہ ہے

سچل سرمست

شعارِ خاص سے اُلجھے شعورِ عام سے اُلجھے
 ہمارا مسلک پرواز کس کس دام سے اُلجھے
 صبا جب زلفِ جاناں کا پیام مشکبُو لائی
 کبھی ہم کُفر سے اُلجھے کبھی اسلام سے اُلجھے
 سرِ منزل شعورِ پاکستہ کھویا کھویا سا
 بسا اوقات اپنے ہی خیالِ خام سے اُلجھے
 سچو ہر کیف و مستی کفر ہے اس بزمِ ہستی میں
 یہ دورِ جام کب تک گردشِ ایام سے اُلجھے

سچل سرمست

راہِ طلب میں
 طبلِ تمنا گونج رہا ہے

اہلِ سلاسلِ چنگ بہ لب زنجیر بہ پا ہیں
 سارے غرقِ زنداںِ وَاہیں
 شورِ بپا ہے
 سازِ نفس ہر ضربِ صبا سے
 وُلولہ خیز آہنگِ صدا ہے
 سینہ گیتی شعلہ نوا ہے
 طبلِ تمنا گونج رہا ہے
 راہِ طلب میں

لو اب سارے رشتہ ہستی ٹوٹ چکے ہیں
 اہل سلاسل چھوٹ چکے ہیں
 دیکھ یہ کیا ہے
 فرش زمیں سے عرش بریں تک
 اک طرفہ سیلاب ضیا ہے
 جس میں عالم ڈوب گیا ہے
 طبلِ تمنا گونج رہا ہے
 راہِ طلب میں

سچل سرمست

کون ہوں میں کون ہوں ؟
 ہاں بتا اے شعبہ بازِ حیات
 کیا ہے تیری کائنات
 اک طلسم بے ثبوت و بے ثبات
 اور میری جاں مثالِ لعبتِ رنگیں صفات
 جس میں رقصاں تیری ذات
 کون ہوں میں کون ہوں ؟
 قصرِ مَر مر ہے یہ انساں کا بدن
 ہے چراغِ نو اسی میں ضوفگن
 اور اسی میں مشعلِ دورِ کہن
 پردہ ہائے تیرگی میں روشنی کے صد کرن
 ایک گوشہ بہرِ یزدانِ ایک بہرِ اہرن

چار سو ہوں کاخ و کو میں خیمہ زن

کون ہوں میں کون ہوں ؟

مثل گل ہوں اور مری خوشبو ہے تو

یا سرابِ آرزو ہوں اور رم آہو ہے تو

موجِ پیچاں ہوں کنارِ جو ہے تو

سایہِ مہتاب ہوں میری حقیقت تو ہے تو

دشمنِ تقدیر ہوں میں جنبشِ ابرو ہے تو

کون ہوں میں کون ہوں ؟

میں خرابِ کفر و ایماں میں اسیرِ تنگ و نام

میں شعارِ گبر و ترسا میں شعورِ خاص و عام

کہکشاں پر ہے کبھی میرا مقام

اور کبھی چہرے پہ گردِ صبح و شام

ہر تصویر ہر تختیل زندگی سے انتقام

اے سمنِ ناز کی ٹوٹی زمام

کون ہوں میں کون ہوں ؟

چین رلے سامی

صبح ازل سے شام ابد تک ایک تسلسل تیرا میرا
 میرا تجرّ موج پریشاں تیرا تلون وسعت دریا
 غرقہ گل سے دیدہ شبنم جانب انجم جھانک رہا ہے
 ذوقِ نو ہو رنگ و بو ہو بھور بھئی تو سب کچھ سپنا
 کالی کالی رین پیا تو میں کوئل کی کوک بنی ہوں
 ایک صدا ہوں ایک نوا ہوں تیری گونج تری ہی مہا
 ناچ رہی ہوں ناچ رہی ہوں تیرے دوارے ناچ رہی ہوں
 من میں آشا آنکھ میں سپنا پیر میں گجرا ہاتھ میں مالا
 شام ہوئی مدہ ماتا سامی پگ دیپ جلاتا سامی
 کس کے دوارے جانکا ہے لٹ چھٹکا تا روتا گاتا

سامی

وہ دیکھو شبِ بنم روتی ہے اور ساری دنیا سوتی ہے
 ہر حرماں اپنا درماں ہے ہر آنسو اپنا موتی ہے
 اک شب ایسی بھی ہوتی ہے جب چاند پہ پیار آجاتا ہے
 جب چاند سے وحشت ہوتی ہے اک شب ایسی بھی ہوتی ہے
 وہ نیند جو اڑتی رہتی ہے وہ آنکھ جو روتی رہتی ہے
 وہ اس دھرتی کی شو بھا ہے وہ اس جیون کی جوتی ہے
 ہے ایک حقیقت دکھ سکھ کی اس جیون کی پھلکاری میں
 جو غنچہ غنچہ ہنستی ہے اور شبِ بنم شبِ بنم روتی ہے
 یہ کیسی کو ملتا کی لو ہے تیرے میرے بندھن میں
 جو تیرا من برماتی ہے اور میری آنکھ بھگوتی ہے

اس چار پہر کی چھایا میں اے چاند کبھی تُو نے سوچا
 کیا تیری ہستی پاتی ہے کیا تیری ہستی کھوتی ہے
 پھر سے وہ ترنم ریز صدا جو راگ بھی ہے بے راگ بھی ہے
 جو سوگ بھی ہے اور جوگ بھی ہے جو داغ عصیان دھوتی ہے
 تو پاپی ہے تو پاپی ہے اے ساتھی کیسا پاپ — مگر
 جب پاپ اُسی کا پر تو جو تیرے من کا موتی ہے

سامی

اک پھول سے جو بن پر بھونرے جب منڈلاتے ہیں گاتے ہیں
 ہم اپنی بیٹی رتیوں کی خوشبوؤں میں کھو جاتے ہیں
 یہ نین سچل یہ پتلے پتلے ہونٹ پیا کے امت سے
 ہر گیان سے بہتر ہوتے ہیں ہر دھیان پہ جب چھا جاتے ہیں
 یہ جیون، نیند کی موجوں پر اک سپنے سا اٹھلاتا ہے
 پھرتا بہ ابد ہم ایک اندھیرے سا گر میں کھو جاتے ہیں
 ہے اپنی مکتی پر بیت پیا من جیت لیا جگ جیت لیا
 وہ راکھ نہیں ہو پاتے جو اس اگنی میں جل جاتے ہیں
 پھر صبح ہوتی پھر شام ڈھلی اس دکھ کی ہیرا پھیری میں
 ہم کیا ہیں کیوں دکھ پاتے ہیں ہم کیا ہیں کیوں دکھ پاتے ہیں

اِن کو نہ جگا اِن کو نہ جگا اے گیانی جا جاتیرا کیا
 یہ مدھ پی کر کھو جاتے ہیں یہ پاپی نیند کے ماتے ہیں
 دکھ سآمی اک دیو داسی ہے جس سے اپنے من مندر میں
 پوجا کر کے پریم پتجار ہی جیون بھر جی بہلا تے ہیں

ساتھی

جہنم جہنم کی راکھ کریدی ملی نہ وہ چنگاری
 نیل لگن کے ہر باسی سے پوچھا تیرا بھید
 پوچھ ذرا چند اسے میں نے کیسے رات گزاری
 پھول پھول میں ڈھونڈی میں نے وہ بھینی بو باس
 اس جیون کی پھلوا ری میں گھوما کیاری کیاری
 کرتا ہے میری کوتاہ میں جگ مگ جگ مگ کون
 بول بول میں گن ہیں کس کے جاؤں واری واری
 آنکھ مچولی کھیلنے والے ابھی جا تو آج
 پاؤں کھوؤں، کھوؤں پاؤں کب تک میں دکھیا ری

ساتھی

پھر رات ڈھلی پھر دیپ بجے اک عالم نیند کا مانتا ہے
 پھر میرا پاپی من مجھ کو مڈھ پینے پر اکساتا ہے
 میں کیسے تجھے سمجھاؤں سکھی وہ پھولوں کی کو ملتا ہے
 میں ایک مہک بن جاتی ہوں جس وقت سخن گھر آتا ہے
 وہ گاؤں کی گوری پتنگھٹ پر جس وقت مسکتی آتی ہے
 ہر تیاگ لرز نے لگتا ہے بیزاگ بہت بل کھاتا ہے
 یہ پریت یہاں کی پریت نہیں ہے تیرے میرے بندھن میں
 اک دور دور کا بندھن ہے اک جنم جنم کا نانتا ہے
 میں اپنے من میں اک سورج کی کھوج لگائے رہتا ہوں
 جب رین اندھیری ہوتی ہے جب نیل کل کہہ لاتا ہے
 جو جنم جنم بھٹکاتا ہے اور نئے نئے دکھ دیتا ہے
 یہ ساتھی مدھرا پی کر کیوں اُس پاپی کے گن بگاتا ہے

سامی

سلسلہ لامتناہی میں آخر کب وقفہ ہوگا
 جینا بھی دکھ، مرنے بھی دکھ، شکھ کیا جائے کیا ہوگا
 آشاؤں کے میلے میں بھی من کے مینت اکیلے ہو
 اس جیون میں کون اے پر تہم تجھ جیسا تنہا ہوگا
 پاؤں تلے آکر اک کیڑا جب دب جاتا ہے سمجھو
 اس سنسار میں کوئی مخفی حشر بپا ہوتا ہوگا
 جوگی کی پہچان بتاؤں کان پھٹے لٹ چھٹکے سے
 دریا دریا آنکھیں اُس کی، من صحرا صحرا ہوگا
 رات گئے یہ باہر گونجی کس کی مٹھی مٹھی تان
 من مورکھ اٹھ بیٹھ کہ در پہ وہ جوگی بابا ہوگا

کبھی کبھی آکاش پہ کوئی محبوب جس نکلے گا
 اس کا مکھڑا بھی اے چندا تیرے مکھڑے سا ہوگا
 رس کے لو بھی بھونرے ہیں سب حیون کی پھلواڑی میں
 لیکن دیکھو ساتھی گزراں مثلِ بادِ صبا ہوگا

میر عبدالحسین سانگلی

پھر وہی بادِ بہار آنے لگی
 جسم و جاں سے بوئے یار آنے لگی
 بدلیوں کی چھاؤں میں کیا بات تھی
 یادِ جاناں بار بار آنے لگی
 رُوح کی گہرائیوں سے دفعتاً
 کوئی کھوئی سی پکار آنے لگی
 پھر گھٹاؤں سے لپٹ کر سونے جلم
 گردشِ لیل و نہار آنے لگی
 میری آنکھوں سے برستے کے لئے
 کوئی رسمِ انتظار آنے لگی
 مدّتوں کے بعد سانگلی آج پھر
 زخمِ پنہاں پر بہاں آنے لگی

(۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک)



بادلوں کی طرح طوفانوں کی زد میں ہے ابھی

رد و کد میں ہے ابھی

خطہ برصغیر

پھر بھی میری آرزو کے

حلقہ قوس قزح میں ہے اسیر

اور میں

شاعرِ اَوّل ہوں اُس کے حسن کا

اور میری شاعری

جیسے عیسیٰ کے لبوں پر شیرِ مریم کی لکیر

اک نئے دورِ محبت کا خمیر

ہاں یقیناً وہ دن آئے گا کہ جب

ختم ہوگی یہ فضائے داروگیر

نسلِ نو کا جاگ اٹھ گا ضمیر

اور میں

شاعرِ اول ہوں اُس کے حسن کا



اے سوالِ پُر خطر
 اے پُرانے نقب زن !
 کتنے برسوں تک لگائی تُو نے سینہ
 لیکن اس دیوارِ لب میں
 کرنے پایا اک شکاف !
 اب کوئی فکرِ گرفتاری نہ کر
 ڈھا ہی دے یک لخت اس دیوار کو
 اس مسلسل جانکشی کو ختم کر
 بے کلی کو ختم کر
 خامشی کو ختم کر



(قبرستانِ مکلی میں)

قصہ حاتم نہیں یہ ایک سچی بات ہے
 گوشِ برآواز ہو
 سن کہ مٹی بولتی ہے
 ”جامِ نندو! کب تلک سوتے رہو گے؟“
 دیکھ دریا خانِ دولہہ کا مزار
 ہل رہا ہے
 اور یہ آواز پھر آنے لگی ہے
 ”جامِ نندو! کب تلک سوتے رہو گے“
 سر پہ سورج آگیا ہے
 رزم گاہِ زندگی میں
 غلغلہ ہی غلغلہ ہے

کب تلک سوتے رہو گے
 نیند میں روتے رہو گے،
 آ کہ ہم سنگِ لحد کو توڑ دیں
 آ کہ پھر جینے سے رشتہ چوڑ دیں“

تاجدارِ سندھ جامِ نند و ادران کے سپہ سالار دریا خاں دونوں دفاعِ وطن
 کے لئے لڑتے ہوئے مارے گئے۔



اے خریدارِ حقیقت

محو حیرت ہو گئے ؟

سوچتے ہو ہمارے مولیٰ کہاں سے لایا ہوں !

سچ ہے ، تیری سوچ میں یہ بات آسکتی نہیں

دار کے تختے پہ ہنس کر اس عملدارِ بغاوت

تانتیا ٹوپے نے ، جو آنسو بہائے تھے کبھی

میرے دامن میں گرے تھے میرے ہی حصے میں آئے تھے کبھی

لیکن اے نا آشنائے اہل جرات

سچ ہے تیری سوچ میں یہ بات آسکتی نہیں



(سندھ صدیوں سے)

رہنے والا ہوں رنیتو

اُس دیارِ درد کا

جس کے صدیوں کے علمبردار سب مارے گئے

سوہنی دھرتی پہ سب وارے گئے

کچھ مورخ آج پھر تہ خانہ تاریخ میں

جھانکتے ہیں

خاک اُس کی پھانکتے ہیں

چاکِ پرچم ٹانکتے ہیں

بال سر کے نوچتے ہیں

اور پھر یہ سوچتے ہیں

پر چیموں سے خون کے دھبے مٹانے چاہئیں
 صاف ستھرے پر چیموں کے واسطے
 کچھ بہانے چاہئیں



اے بھٹائی

پیرو مرشد!

اے اسیرِ حسنِ ذات

بے نیازِ رنگِ بوئے کائنات

اے ثباتِ بے ثبات

میں کہ ہوں مجوِ صفات

اس ظلمِ بادِ ہوا میں روز و شب

بے سبب اور بے ادب

کائناتِ بے کراں کو مسترد کرتا تھا میں

رد و کد کرتا تھا میں

آج پھر میں تیرے در پر آبا ہوں

ہدیہِ فہم و فراست لایا ہوں

اے بھٹائی

پیرو مرشد !

ہے غمِ جاناں حقیقت

اور غمِ دوراں حقیقت

اور بالا تر سبھی سے

ہے غمِ انساں حقیقت

اب مگر میں مانتا ہوں اک غمِ بے نام بھی ہے

اور بامعنی و مقصد تیرا ہر سچا نام بھی ہے

آج تم سے فیصلہ کر کے اٹھوں گا

جامِ صحت تیرا میں بھر کے اٹھوں گا

اے بھٹائی

پیرو مرشد !

متفق ہے تو کہ ہر تخلیق سے ہے خوب تر

کائناتِ بے کراں میں زندگانیِ بشر

پر تو حسین ازل ہے

بے بدل ہے

جانتا ہوں میں کہ ہے یہ بے ثبات

اور یہ کام نہنگِ کائنات

روز و شب اُس کو نگلنے پر تلا ہے

ایک دروازہ کھلا ہے

جس سے جا کر کوئی ٹوٹ آتا نہیں

پھر دیارِ درد میں خبا تا نہیں

اے کہ تارِ عنکبوتِ کائنات

سے ہے واقف تیری ذات!

تو کہ اسرارِ ازل سے آشنا

یہ بتا

کیا کسی انسان پہ اتناں کے ستم کا ہے جواز؟

اپنے شناسائے حقیقت اور دانائے مجاز

آج میں ظلم و ستم سے برسرِ پیکار ہوں
 جب کبھی فرصت ملی تیار ہوں
 تیرے بحرِ پیکاراں میں دور جانے کے لئے
 اور دل حیراں میں اک غوطہ لگانے کے لئے



اے تصنع کے امین !

فرق تیرا اور اپنا جانتا ہوں

جانتا ہوں میں کہ تیری شاعری

چاہِ نخب سے ابھرتا چاند ہے

اور میری شاعری

جیسے موہنؑ جو ڈرو پر ہو طلوعِ آفتاب

اے تصنع کے امین !

مانتا ہوں میں کہ تیری شاعری

ہے ردیف و قافیہ سے آشنا

ہاں مگر تیرا تخیل

اک فریبِ دیدہ نابین ہے

۱۔ صحیح تلفظ موہن جو دار و نہیج موہن جو ڈرو ہے



آج پھر پُروا چلی
 پھر جُگوں کی پریت یاد آنے لگی
 میں تجھے پھر ڈھونڈھتا ہوں اُروشیؔ
 میں کہ وکرم بھی ہوں کالی داس بھی
 آج پھر تیرے لئے بے چین ہوں
 تیرے بالوں کی سگھت روں سے پرے
 میں کویتا لکھ تو لیتا ہوں مگر
 اس تعقن سے بھری دنیا پہ میں
 چادرِ مشکیں سجاؤں بھی تو کیا
 پریت کے کچھ گیت گاؤں بھی تو کیا

لے کالی داس کے ڈرامہ وکرم اُروشی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

ہائے کتنی تیز ہے بوئے کفن
 ہائے کتنی تنگ ہے کوئے وفا !
 کاش مجھ کو چھوڑ کر جاتی نہ تو
 مجھ سے نانا توڑ کر جاتی نہ تو !



تجھ سے دُور، کدم کے اوپر
 نیلے بنبھ میں چاند —
 پہچانے پھولوں کی پگ پگ
 سوندھی موہک باس
 ہنسی کی تانوں سے من میں
 ایک انوکھی پیاس
 کیوں اُن سب کو چھوڑ کے مُورکھ
 اپنا یا بنواس ؟
 میری نگر یا میں جو آئے
 سب کچھ کھو کر تم کیا پائے
 میں کیوں تیری باتیں سن کر

اپنے من کو روگ لگاؤں ؟

تیرے بھیانک سپنے کو میں

کیوں اپناؤں ؟

اپنی نیند بھری آنکھوں کا

چہن اڑاؤں ؟

میرے نیم پہ ٹھک ٹھک کر کے

نیل کنڈھ کو تو نے اڑا یا

اور میرے اکتارے کو کیوں

ٹھوکر ماری کیا ہاتھ آیا ؟

چہن نہ پاؤ گے مرنے تک

کچھ پہچانو اپنا پرایا

اب بھی واپس جاؤ مورکھ

اپنوں کو اپنا و مورکھ
 آج بھی ہے پہلے سب سندر
 تجھ سے دُور، کدم کے اوپر
 نیلے نبھ میں چاند —



بھور بھئی اور پنچھی جاگے
 اجیارے نے انگڑائی لی۔
 اوس میں بھیگی کلیاں جاگیں
 نیند میں ڈوبی گلیاں جاگیں
 گائیں جاگیں گوالے جاگے
 دھرتی کے رکھوالے جاگے
 اب کرنوں کی باگیں تھامے
 پورب کا رتھ دان بڑھے گا
 اور جیون کی بھن بھن باتیں
 دن بھر کانوں میں گونجیں گی
 چاند کے چرنوں میں ہی میں نے

گاتے ساری رین گزاری
 دُنیا سوئی اور میں جاگا
 دُنیا جاگی ، میں سو جاؤں
 اب تو وینا پر سر رکھ کر
 میٹھے سپنوں میں کھو جاؤں
 اب تم میرے گن اور اوگن
 بیرن دھرتی بھول ہی جاؤ
 مٹی سے کیا بئیر رکھو گی ؟
 میری بلا سے اب ٹھکراؤ
 یا مرے گیتوں کو اپناؤ
 میں نے تم کو معاف کیا ہے
 اب میں چین سے سو جاؤں گا



دور کی تلاش سے
 چاند ہیمنت کا
 میرے من کو ہمیشہ بلاتا رہا
 میں کہ زبیر تھا
 تو میں لڑتا رہا
 بڑھپیوں کے تلے
 جھپکیاں نیند کی
 مجھ کو اس آگئیں
 رن پر سوج کے نکٹھ
 جب چمکنے لگے
 میں نے چہرہ نہ اُن سے چھپایا کبھی
 زیت تانبا بنی

میرے تلوے جلے

برچھ کی چھاؤں میں میں نہ بیٹھا کبھی
گھاؤ جب بھر گئے میرے ہر انگ پر
کتنے کالے گلابوں کے پودے ملے
بُیروں نے کبھی یہ شکایت نہ کی
میں نے لڑتے ہوئے وار اوچھے کئے
مارنے سے کبھی ہچکچاہٹ نہ تھی
اور نہ مرنے کا ڈر

ہاں مگر

رن کی جلتی ہوئی ریت پر

دور کی لاش سے

چاند ہیمینٹ کا

میرے من کو ہمیشہ بلاتا رہا۔

موسم سرما لے نکھ۔ ناخن



میری بچی مسکراتی آنکھڑیوں سے
 دیکھتی ہے اپنی ماں کو
 جیسے روزِ آفرینش
 شاخِ طوبیٰ پر شگوفہ
 دیکھتا ہو موجہِ تسنیم کو
 چند لمحوں کے لئے میں ہر امید و بیم کو
 طاقِ غفلت پر بھٹا کر کھو گیا ہوں
 اور پھر یہ سوچتا ہوں
 میں کہ تاریخی تسلسل کی صدائے کن فکاں
 میں ہوں پابندِ سلاسل
 اور اپنی بیڑیاں

کھڑکھڑاتا جا رہا ہوں

لڑکھڑاتا جا رہا ہوں

سوئے روز آفرینش

بطن ہستی میں ہے جواب تک نہاں

کھینچتا رہتا ہے میری روح کو

آدمِ نو کا بہشتِ بے گماں

سوچتا ہوں

اس شگونے کو کنارِ موجِ تسنیم پر

چھوڑ کر جاؤں اگر

مجھ پہ الزامِ جفا تو آئے گا

ہائے کتنے لوگ ہیں میرے وطن میں باشعور

جانتے ہیں جو وفا کی وسعتِ کونین کو



بھور ہوئی ہے

آک کے نیلے پھول کھلے ہیں

سوکھی ہوئی دھرتی کی آنکھیں کتنی آس لگاتے

دیکھ رہی ہیں ساون رت کی آنے والی گھٹاؤں کو

تپتے ہوئے رن کی دھرتی پر چھانے والی چھاؤں کو

ان پھولوں کی موہنی آنکھیں کتنی سندر لگتی ہیں

سب کے من کو ٹھگتی ہیں

کس نے دیکھا برسوں کا پس ان کی نیلی سنسن میں

کس نے سوچا سورج ان پر کب تک بان چلائے گا

کرنوں کو برسائے گا

پاگل ہے پچھتائے گا

اپنا کس بل کھوئے گا
 آخر ڈوب ہی جائے گا
 وہ کیا جانے
 زہر میں ڈوبی نیلی آنکھیں دھوپ میں کب کھلاتی ہیں



قحبہ دور کہن
 روکش آئینہ حال وطن
 رنگ و روغن سے تو کچھ بنتا نہیں
 تیرے چہرے کی ٹھٹھرتی جھڑیاں
 گرمی حسنِ جوان
 پا نہیں سکتی کبھی
 قحبہ دور کہن
 بے نیازِ قیل و قالِ انجن
 کیا زلیخا نام رکھ کر
 دامنِ یوسف کو ہتھیانے چلی ہے
 قحبہ دور کہن

سوچ کچھ ، اتنا نہ بن
یہ نقاب سبزی تیرے زرد چہرے کو چھپا سکتا نہیں
کچھ سیاسی بے حیاؤں کے سوا
اب نہ گاہک بنا سکتا نہیں —



عشق میں نے بھی کیا ہے یارو
 لیکن اس دورِ ستم میں مجھ کو
 حرفِ بے معنی و مقصد سے سروکار نہیں
 نسلِ انساں کی افزائش کے
 ایک پہلو پہ ہزاروں اشعار
 کوئی دیوانہ ہی کہہ سکتا ہے
 تھر کے تپتے ہوئے صحرا میں بنول
 ایک مدت سے ہیں بانہیں پھیلائے
 بدلیاں دُور سے آتی ہیں چلی جاتی ہیں
 اور میں گرم سفر ہوں کب سے
 میرے پاؤں میں پھپھولے بڑھ کر

ریت پر سرخ لیا روٹ کی طرح لگتے ہیں
 پیاس میں سوکھ گئی ہے یوں زباں
 شلخ تھوہر پہ ہوں کانٹے جیسے
 ہاں کئی سال ہوئے

میں نے پایا تھا اُسے چشمہ شیریں کی طرح
 اُس کے نینوں میں ہراساں تھے ہرن
 اور بانہوں سے گھٹاساؤں کی
 موسلا دھار برسنے کے لئے اُمٹھی تھی
 اب وہ اک پھول سا بچہ لے کر
 سوچتی ہوگی کہ کب لوٹے گا
 میری آغوش کو بھرنے والا
 مجھ کو جانا ہے بہت دُور ابھی

غلہ بیر کی طرح ایک سرخ پھل

دُور ہے دُور بہت کارونجھر
 جس پہ موروں کے دیئے
 جب چمکتے ہیں سرِ شام تو یوں لگتا ہے
 رام بنوا اس سے لوٹ آیا ہے
 عشق میں نے بھی کیا ہے یارو
 لیکن اس دورِ رستم میں مجھ کو
 حرف لے معنی و ممتا، نہ سروکار نہیں



(قرض منصور)

دورِ منصور کئی سال ہوئے ختم ہوا
 جی میں آئی ہوئی ہر بات کیا کرتے تھے
 تختہ دار سے ہم لوگ کہاں ڈرتے تھے
 نعرہ حق سے ستونِ مقتل
 کانپ جاتے تھے اچانک دلِ قاتل کی طرح
 اور پھر قاتلِ سفاک نے یہ حکم دیا
 ”سرفروشنوں کی زبانیں اکدم
 کاٹ دو دشمنِ عیاری سے“
 دورِ منصور کئی سال ہوئے ختم ہوا
 کر مکِ چوب بنے اور ستونوں میں چھپے
 (کتنا مشکل ہے صدائے دل کا،

گوشِ انساں سے کنارہ کرنا (

چشمِ قاتل سے نہاں

اب شبِ دروز ستونوں میں رہا کرتے ہیں

کاٹتے رہتے ہیں مقتل کے رگ وریشے کو۔

چوڑ ہو جائیں گے اک دن یہ ستوں اندر سے

ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔

جب یہ مقتل کی گراںبار فصیلیں کٹ کر

دھم سے گر جائیں گی ناگاہ سرِ قاتل پر

کرمکِ چوب نکل آئیں گے

اپنے بے خواب نہاں خانوں سے

اور اک رقصِ طربناک بپا کر دیں گے

قرضِ منصور کو یک لخت ادا کر دیں گے



آج کتنی گرم ٹوچنے لگی ہے

اور میرے خشک لب

شہارِ تھوہر کی طرح سوکھے ہوئے ہیں

کون جانے نیل کنٹھ

آج کن سوکھے درختوں میں چھپا ہے

اور مینا سوچتی ہے

اس فضاے آتشیں میں راکھ ہو جائیں گے پر

اس سے بہتر ہے کسی کے پنجرے میں بند ہونا

اور کوئل اڑ گئی ہے

اک دیارِ ابرِ باراں کی طرف

ہاں فقط

چند کرگس کھا رہے ہیں لاش کو

اور اُن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں



اے معرّی

اے مرے خرگوش سن !

تیری عظمت کا تو میں منکر نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہیں فوق البشر

تیرے جیسے ہی اہنسا کے پجاری

احترام زندگی کرتے ہیں جو —

ہاں مگر یہ بھیڑے

یہ درندے

روز و شب چنگھاڑتے اور چیرتے

منکرانِ احترامِ زندگی

کھینچتی ہے جن پہ میری شاعری

اپنی تیغ بے نیام
 اُن کا کیسا احترام !
 اور کبوتر کو بچانے کے لئے
 کاٹ لیتا ہوں اگر شاہیں کے پر
 منطقی تکمیل تیری بات کی کرتا ہوں میں



پھر سے اور نگ زیب اور خوشحال خاں
 کوئے جنت میں مقابل آگئے
 اک فرشتے سے کہا خوشحال خاں نے
 ”کوثر و تسنیم کے کنٹھوں پہ میں
 کب تلک گاتا رہوں اپنی غزل
 مجھ کو اک شمشیر دے دو
 لویہ سب طوبیٰ کے پھل “



اب تک میرے من میں کبیرا پیت کا دھاگا کا تھا ہے

جنم مرن کے بیچ میں ندیا

اب تک بپھری ناگن بن کر

زور سے لہریں مارے

یہ دھاگا اک پل ہے پیارے

اس نفرت اور خوف کی دنیا

میں یہ دھاگا

راکھی بندھن بن سکتا ہے

آؤ پریم دوارے

آؤ بھاؤ

بیتی باتوں کے انگارے

اب تک میرے من میں کبیرا پیت کا دھاگا کا تھا ہے



منش وہی ہے

اپنے کئے پر جو پھٹتائے
اور پسو ہٹ کرتے ہیں
کیا کانٹوں کے ڈھیر پہ کوئی
خود ہی پھول کھلے گا بھائی
پریت کا نانا توڑ کے تجھ کو
کیسا موکش ملے گا بھائی

محل، دو محلے، کاریں، نوکر
یہ سب کچھ تو پایا تو نے
چار کھلونے لے کر مور کھ
اپنا جنم گنوا یا تو نے

پہنچی چھوڑے، پیر بسارے
 ندی نالے کھوئے تو نے
 اور غصے سے بہتے آنسو
 اس دھرتی میں بوئے تو نے

ایک پرانی پُستک لے کر
 کتنی اکڑ فوں کرتے ہو تم
 اس دھرتی کے گیان سے لیکن
 من ہی من میں ڈرتے ہو تم

میری کویتا کے شہدوں میں
 جنم جنم کا بندھن پا کر
 کتنا شور مچاتے ہو تم
 کل سے میرے دوارے آ کر

میں نے سارا چین لٹا کر
 اک سپنے کو مول لیا ہے
 مجھ سے اتنا کیوں چڑتے ہو
 تجھ کو تو بن مول دیا ہے

اب تک مجھ کو دکھ ہے بھائی
 تیرے ٹوٹے ہوئے درپن کا
 مجھ سے بدلہ کیوں لیتے ہو
 اپنے من کے بھدے پن کا

منش وہی ہے
 اپنے کئے پر جو پچھتائے
 اور پسوہٹ کرتے ہیں



سندھ میرے وطن

میں تری پیڑ پر سوچ کر

ایک گہرے سمندر میں ہوں غوطہ زن

ڈوب جاتا ہے تیرہ تلاطم میں دل

عصر حاضر ہے یا موج بے کفن

ہاں ابھر کر کبھی دیکھ لیتا ہوں میں

موجِ غم سے ترا ساحل بے نشان

ڈوبتی کشتیاں

اور پھٹے بادِ ہاں

اور مانجھی کہ منجھدار کو جانتے ہی نہیں

اور اپنی سکانوں کو پہچانتے ہی نہیں

دُور مشرق سے اٹھا ہے طوفانِ سا
 یم بہ یم آرہا ہے تغیر لے
 دمِ ندیم پھیلتا از کراں تا کراں
 کون جانے مجھے وہ اُچھالے کہاں
 کون جانے ترا ساحلِ بے نشان
 میرے پاؤں کو چومے اچانک کبھی
 میرے ہونٹوں پہ اک مسکراہٹ رکھلے!



گو انا الحق تو نہیں کہتا ہوں میں

اور نہ میں منصور ہوں

دار پر دارین کو وارے ہوئے

سوئے مقتل جا رہا ہوں

مسکراتا

گیت گاتا

اے مرے جلا دکیا تو جانتا ہے

کون سی وحدت کا دعویٰ کر رہا ہوں

کس حقیقت کے لئے میں مَر رہا ہوں !



قاضی القضاۃ نے
 کل یوں اورنگ زیب سے کی گفتگو
 "سرمدِ مستِ اُست
 قافیہ پیا تو ہے
 اُس کو مروانا ضروری تو نہیں"
 اِس پہ اورنگ زیب نے ہنس کر کہا
 "ہر رباعی اُس کی اک تلوار ہے
 جس کی نوک بے اماں
 قافیے پر ختم ہوتی ہے بظاہر
 درحقیقت میری گردن کاٹی ہے



نسلِ نو !
 تو سایہِ ابلیس میں
 جب ہوئی پل کر جوان
 میں نے اک تصویر تیرے سامنے
 لا کے رکھی دفعتاً انسان کی ۔
 تو نے جبراً ہو کے دیکھا اور کہا
 ”یہ تو اک ابلیس ہے“
 پھاڑ دو اس بد نما تصویر کو“
 سوچتا رہتا ہوں تب سے
 انقلابِ دید کیسے لاؤں میں
 نسلِ نو کو کیسے پہچاؤں میں
 کون سا ابلیس ہے
 اور کون سا انسان ہے



کوچہ جانناں کی جانب جو گلی جاتی تھی اب سنان ہے

کل ہزاروں لوگ تھے جو لے کے اپنا چنگ و دھ

ناچتے گاتے چلے تھے صف بہ صف

اُن گلوں کی خامشی اب بھائی سرطان ہے

موڑ پر اب خشم آگیاں اک بڑا عفریت ہے

زندگی کے غلغلے پر خامشی کی جیت ہے

تم تو کہتے ہو کہ اس عفریت سے

اک نئے عفریت کو ٹکرائیں ہم

غلغلہ برپا کریں کچھ اپنا جی بہلائیں ہم

سوئے مستقبل ہر اسان دیکھ کر

سوچتا ہوں میں مگر

وہ نیا عفریت اس سے بھی برا ہو تو کہاں ہم سر چھپائیں

اُس گلی میں کیسے جائیں !



اک خموشیِ قعرِ غم میں غوطہ زن
 روکشِ روئے حسیناں
 اک متحنتِ زندگانی کا چلن
 خاکِ پروانہ پہ خنداں
 بے نیازِ دودِ شمعِ انجمن
 جرأتِ رنداں پہ حیراں
 ساغرِ ہستی سے منہ پھیرے ہوئے تاشنہ دہن
 اپنی موجِ بے حسی میں ڈوب کر
 اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے بادبانِ فکر و فن
 اک خموشیِ جرمِ آزادی کی پاداشِ گراں
 گردنِ ناتنا سرِ دار و رسن

از سیرِ نو نعرہ ہائے بے اماں کی پرورش کرتی ہوئی
 بطنِ دوراں میں نہاں جہدِ وطن
 خلوتِ بے انجمن
 اک ہجومِ بے کراں کو ساتھ لینے کے لئے
 غرقِ موجِ اضطرابِ جان و تن -
 یہ خموشیِ زندگی ہے
 وہ خموشیِ موت ہے



بیا تم میرے ساتھ چلو گے ؟
 سورج جب تپ جائے گا تب اک ہی چٹا میں ساتھ چلو گے ؟
 میری عمر یا بیت گئی ہے
 مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
 لیکن میں نے مان لیا ہے
 اُس بگیا میں لال بھبھو کے پھول کھلے ہیں
 کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں !
 لہو لہان ہیں میرے پاؤں
 پھر بھی میں بڑھتا جاتا ہوں
 دیکھو کیسے چٹانوں پر میں دھیرج سے چڑھتا جاتا ہوں
 اب تو پہاڑوں کے بیچ و خم میرے لئے انتخاب نہیں ہیں
 اور اکیلے پن کے سبب غم میرے لئے بیگانہ نہیں ہیں

اے پردیسی تم رستے میں آن ملے ہو
 میری طرح تم بھی وہ بگیا ڈھونڈ رہے ہو
 جس میں کرڈروں لال بھبھوکے پھول کھلے ہیں
 میری عمر یا بیت گئی ہے

مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
 کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں
 اور نازک ہیں تیرے پاؤں
 کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟

سورج جب تپ جائے گا تب اک ہی چٹا میں ساتھ چلو گے؟



گورے سانپ بلوں میں بھاگے
 آزادی کے نام پہ ہم کو
 کالے سانپ ملے

کاٹ وہی پھنکار وہی ہے
 اپنی ہریالی دھرتی پر
 سانپوں کی یلغار وہی ہے

امرت میں بس گھولنے والے
 ان سانپوں کے چند سپیرے
 روپ کے اُچلے من کے کالے
 اس بستی میں ڈال کے ڈنرے

اب تک پڑھتے ہی رہتے ہیں
 جھوٹے منتر سا بچھ سویرے

سچ کی لاسٹھی ٹوٹ چکی ہے
 اُس کو پھر سے جوڑ لو ورنہ
 تیری قسمت پھوٹ چکی ہے

گورے سانپ بلوں میں بھاگے
 آزادی کے نام پہ ہم کو
 کالے سانپ ملے ۔



بارشیں ہوں گی، رہ ہستی پہ تھم جائے گی دھول

اور دونوں سمت گہرے سرخ پھول

جب کھلیں گے

تب ملیں گے

تا اُفق جس وقت ہوگی اک فضائے سرخ رنگ

اپنے کا شانوں کو لوٹیں گے کلنگ

سب ملیں گے

تب ملیں گے

تیرے میرے آنسوؤں میں ایک طوفاں آئے گا

دیکھتے ہی بعد سب مٹ جائے گا

کب ملیں گے

کب ملیں گے



باز آیا میں ترے نروان سے شاکیہ مٹی

ٹسکھ نہ ہوں گے

دکھ نہ ہوں گے

اک خلائے بے کراں میں آتما کھو جائے گی

کیا یہی تم کو ملا ہے

عمر بھر کے تزکیہ کا یہ صلا ہے ؟

جنم کے چکر سے چھوٹے

بلبلے کی طرح پھوٹے

اے مرے پیغمبرِ والا صفات !

جنم کے چکر سے ہی ہے رنگ و نورِ زندگی

سہرِ سرورِ زندگی

کائناتِ بے کراں میں روپ کیا دھاروں گا میں

ایک برگ سبز پر نروان کو واروں گا میر
 گر مجھے ہو اس پہ کوئی اختیار
 اس زمیں پر آؤں گا میں بار بار
 کھیلے بچوں کی یہ کلکاریاں
 اور سندر تاریاں

جن کے ہونٹوں میں کٹے انجیر کی لالی، مٹھاس
 آتما کی بھوک پیاس

چہچہاتی آرزوئیں لہلہاتی زندگی
 مجھ کو اس دھرتی پہ پھر لے آئے گی
 تا ابد اک تیرگی یا روشنی، جو کچھ بھی ہو
 دکھ نہ ہوں

اور سکھ نہ ہوں

ہستی پائیدہ ہو یا نیستی، جو کچھ بھی ہو
 گلبلا جاتا ہوں اس امکان سے شاکیہ مُنی!



اب تو سورج ڈھل رہا ہے

پر بتوں میں

تھک گئے ہیں اس کے پاؤں

پھر بھی کوئی چل رہا ہے

پر بتوں میں

ریت کے ٹیلے پہ یہ جو

اک دیا سا جل رہا ہے

پر بتوں میں

اک نئے سورج کا سپنا

اس دیئے میں پل رہا ہے

پر بتوں میں

آئے والا دن ابھی ہے
 اپنی آنکھیں مل رہا ہے
 پر بتوں میں



خونِ انساں بہہ رہا تھا کل یہاں
اب تو بھنگی دھو گئے ہیں راستے کو
خونِ انساں نالیوں میں جم گیا ہے !

ہاں یہاں کل خونِ انساں بہہ رہا تھا
اور سب سے کہہ رہا تھا
میں کہ چاول اور مچھلی سے بنا ہوں
نغمہ شگور بھی ہوں

اور سگھندوں میں پلا ہوں
مجھ سے اک ماتھے پہ ٹیکا تو لگاؤ
اس طرح میں رایگاں جانے نہ پاؤں !



کیوں تم مجھ کو چھیڑ رہے ہو ؟

اب تو بھول چکا ہوں میں اُن مدھماتے نینوں کی باتیں

یاد دلاتے ہو کیوں مجھ کو بھولی ب سری پریت کی راتیں

اس جیون کے کٹھن ڈگر پر چھاؤں نہ ہوگی ان باتوں سے

کیسی ٹھنڈک چاہتے ہو تم بھولی ب سری برساتوں سے

پگ پگ جلتے پاؤں دیکھو

سر پر آگ برستی دیکھو

بوند بوند کو میری دھرتی

اک مدت سے ترستی دیکھو

جلنا بھی ہے چلنا بھی ہے

دُور بہت منزل ہے ساتھی

میں نے کب انکار کیا ہے

میرا بھی اک دل ہے ساتھی

اس جیون کے کڑے کوس میں جب بھی جوانی یاد آتی ہے
 اک ہرنوں کی ڈار نظر آتی ہے اور پھر کھو جاتی ہے
 مدھ ماتے نینوں کے بادل چاروں اور اُمنڈ آتے ہیں
 بسری پیت کے کٹنے سپنے گھور گلن میں کھو جاتے ہیں

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے
 سر پر آگ برستی دیکھو
 بوند بوند کو میری دھرتی
 اک مدت سے ترستی دیکھو
 پاؤں بڑھاؤ سا تھی ہم کو
 چلنا بھی ہے جلنا بھی ہے
 اس جیون کے لمبے دن کو
 جلتے جلتے ڈھلنا بھی ہے
 کیوں تم مجھ کو چھیڑ رہے ہو !



بے تحاشا صبح و شام
 ریڈیو، اخبار، ٹی وی بک رہے ہیں
 روکشِ حالِ عوام
 رات دن پیغام پہنچانے کے بعد
 مخبرانِ پر شکستہ کابکوں میں بوٹتے ہیں
 درپئے سودائے خام
 کچھ محقق صدیوں کی قحبہ ژولیدہ موکو
 شانہ تحقیق سے آراستہ کرنے چلے ہیں
 زیرِ تیغ بے نیام
 اب فسانہ گو مثالِ شہرِ زاد
 ہر شبِ غارت کو اپنے مکروجن سے ڈالتے ہیں

اور شعرائے کرام
 اہل دل کی ہڈیوں کے ڈھیر کو
 سنگ و آہن کی فصیلیں باندھتے ہیں
 مثل موج بے خرام
 ہم کہ ہیں ساحل نشینوں سے پرے
 و رطہ غم سے ابھر کر سوچتے ہیں
 ہر حلالی لفظ سے اپنا مقام
 فاشیت کے دور میں کتنے حرامی اصطلاح
 ڈھیسٹ پن سے چھینتے ہیں
 بے تحاشہ صبح و شام
 ریڈیو، اخبار، ٹی ٹوی بک رہے ہیں



وہ گرا ، دھم سے گرا
 خون میں لت پت ہو گیا
 اور ابد تک سو گیا
 ایک شاعر مر گیا
 ہر دلا نہ وار اپنے دور پر یوں کر گیا
 خود کشی کی ، ڈر گیا
 پھاند کر دیوار اپنے گھر گیا
 لوگ اُس کو چور سمجھے ۔
 کیا دہانِ گور سمجھے
 پوپلے پن میں یہ کیسی کپکپی ہے !



تم کہ نے ہو

ایسی شے ہو

ساز بن سکتی ہے جو

میرے ہونٹوں کی ابد تک

مُرّتش آواز بن سکتی ہے جو

اک سراپا راز بن سکتی ہے جو

سوچتا ہوں تجھ کو اپنے سانس سے گرماؤں میں

تیرا پیکر نغمہائے سرمدی بن جائے گا

لحہ عشق پر افشاں اک صدی بن جائے گا

سوچتا ہوں گاؤں میں

تیرے آغوشِ ترنم کو ذرا برماؤں میں

تم کہ نے ہو

میں کہ لے ہوں



دامنِ آتش فشاں میں یہ جوا خانہ تو دیکھ
 حرصِ زر میں ہر ادائے بے حجابانہ تو دیکھ
 ہر کسی کی چشمِ مے گوں مثلِ پیمانہ تو دیکھ
 اور جوا لا کہ اپنے جی میں ہے ٹھانے ہوئے
 اور کماںِ تقدیر کی تانے ہوئے
 کون جانے کب پھٹے گا
 آتش و آہن کے تیروں میں بٹے گا
 کب فسونِ شب بٹے گا
 کب بٹے گا، کب بٹے گا !



خاک کو سرسبز کرنے کے بغیر

ابر نیسانِ بہار

یوں گزرتا ہے چمن سے بار بار

تشنہ گانِ زیست سے جیسے اُسے ہو کوئی پیر

میری چشمِ آبدیدہ کو کرے گا کون سیر؟

خوشہ انگور سا میرا جگر

آبیاری کر رہی ہے جس کی چشمِ اشکبار

ہاں مگر یہ میری آہ بے اثر

بار ہایوں ہو گئی ہے منتشر

تاک کو سرسبز کرنے کے بغیر

جس طرح وہ ابر نیسانِ بہار -



قوم نے تیری قدر نہ کی، یہ سوچتے ہو
 کیوں اپنے پر نوچتے ہو؟
 اپنی صلیب سے آزرده ہو؟
 اُس کو پھینک کے دیکھو تو
 اک دم کا ندھے جھک جائیں گے
 چُک جائیں گے۔

لوح و قلم سے بھاگتے ہو؟
 ہاتھوں کو مغلوج کرو گے؟
 کیا اتنا تاوان بھرو گے؟
 قوم جو تیری قدر کرے تو یہ سمجھو

تم اور تمہاری سب تحریریں
 لوح و قلم کی یہ تقدیریں
 پتھاریوں کے کام آئیں گی
 پڑیا پڑیا بیٹ جاتیں گی



اے پرندو! انھیں بتاؤ کہ میں
 بوڑھے برگد کی چھاؤں سے کتنا
 اپنے بچپن سے پیار کرتا ہوں
 اپنی رگ رگ کو ریشے ریشے کو
 ان جڑوں پر نثار کرتا ہوں
 اے ہواؤ! انھیں سناؤ کہ میں
 ریگ صحرا پہ برق و باراں کو
 اپنے اجداد کی طرح اب تک
 سجدہ بے اختیار کرتا ہوں
 اپنی دھرتی کے دیوتاؤں میں
 بادلوں کو شمار کرتا ہوں

چاند جب چیت کے مہینے میں
 اپنی کرنیں بکھیر دیتا ہے
 کتنی صدیوں کی سرحدوں کو میں
 ایک لمحے میں پار کرتا ہوں
 پوس میں اوس بھیگی کلیوں پر
 میرے من کو آداس کرتی ہے
 میں کہ اک صبح کا جوانی سے
 آج تک انتظار کرتا ہوں
 سوچتا ہوں سفید بابوں کے
 تارِ سیمیں بکھرنے جائیں کہیں
 مجھ کو خوابوں کا خوں بہا نہ ملے
 اور ویرانہ حقیقت میں
 پھول کوئی کھلے، کھلے نہ کھلے

ایک دن کہکشاں کی ڈولی میں
 زندگی الوداع کر جائے
 اور مری شاعری بھی میرے ساتھ
 خاکِ صحرا پہ یوں بکھر جائے
 جس طرح گرد میں بگولوں کے
 پھول جھڑ جاتے ہیں پہلوں کے



آج کیوں پھول لاتے لگے
 اور عقیدت کی شمعیں جلانے لگے
 میری برسی منانے لگے !
 جاؤ جی جاؤ جی !

اپنی بیوی کے رانوں پہ ہاتھوں کو گرماؤ جی
 اس کا سینہ نگاہوں سے برماؤ جی
 اب اشاعت گھروں میں کتابیں مری کوئی چھاپے تو کیا
 راکھ پر ہاتھ تاپے تو کیا
 مجھ کو پیانہ وقت ناپے تو کیا
 خاک سے لو لگائے تو کیا
 میرے بسرے ہوئے گیت گائے تو کیا
 پھول لاتے تو کیا

اب تو آدھی صدی ہو گئی ہڈیوں کو ٹھٹھرتے ہوئے
 قبر پر گاؤں کی چاندنی کو نکھرتے ہوئے
 اوس کے آنسوؤں کو بکھرتے ہوئے

اب مجھے انتظارِ شناسِ سخن ہی نہیں
 پاسِ فن ہی نہیں
 کوئی اپنے لئے حسنِ ظن ہی نہیں



بانہہ ٹہنی سی تھی ہاتھ تھا پھول سا

میری محبوبہ کا

چاندنی جم گئی رات پالا پڑا

پھر بھی نکھڑا رہا اس کا رنگِ حنا

ہاتھ تھا پھول سا

میری محبوبہ کا

میرے گھوڑے کی باگوں پر آکر رکا

ہاتھ وہ پھول سا، کوئی کہنے لگا

تم کہاں جا رہے ہو سونے پیا؟

میں تو سننے لگا تھا سموں کی صدا

رن سے آتی ہوئی سناتی ہوا

اُس کو چھوتی رہی، میں چلا ہی گیا

اب تو لڑتے ہوئے شام ہونے لگی
اور لہو کی لہک رنگ کھونے لگی

لاشیں بکھری ہوئی، میں کئی ریت پر
ایک سوکھے ہوئے کھیت پر
من کھڑا سوچتا ہو کہ کیوں جھڑ گیا
ہاتھ وہ پھول سا
میری محبوب کا !



ساقِ سیمیں کئی نیمِ عسریاں کئے
 طاقِ نسیاں پہ جب میں سجانے لگا
 میرا ہمزاد مجھ کو بلانے لگا
 "اتنی جلدی بھی کیا اے مرے بواہوس
 چہچہاتے پرندے ابھی تک ترا
 ڈھونڈتے ہیں قفس
 شامِ گلرنگ کو جام میں ڈھال دے
 عمرِ وارفتہ کو تتلیوں کے لئے
 اک نیا جال دے
 یہ سوانحِ نویسی تری خبطِ بے رنگ ہے
 وقت تو تنگ ہے
 پھر بھی لکھنے پہ جینے کو ترجیح دے "



پات جھڑنے لگے رُت بدلنے لگی
 اب مری رنگ و بو سے لذی شاعری
 ایک چمپا کا سوکھا ہوا برچھ ہے
 کون جانے کہ کب اس میں پھول آئیں گے

اور سبھیوں کے جھرمٹ مری سمت بالوں کو لہرائیں گے
 اُن کے جوڑوں میں گجرے مری باس مہکائیں گے
 اُن کے ہاتھوں میں لپیٹ ہوئی میری رنگت سروں پر گھڑوں
 میں مہک جائے گی

اور پینگھٹ پہ کوئل جو کوکے گی تو کوک اُس کی مہک
 میں چمک جائے گی

پھر کلاہوں کے مد پر جوانی بہک جائے گی
 کون جانے کہ پھر اک نئی رُت مری شاعری کے لئے آئے گی
 اور چمپا کا سوکھا ہوا برچھ پھولوں سے لد جائے گی



جانتا ہوں کہ وہ وقت آئے گا
جب مری شاعری کو اچانک کبھی
چاند آکاش گنگا میں نہلائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
جب زباں کا تعصب نہ ہوگا کہیں
میری خوشبو سے ہر اک مہک جائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
جب نگر اور ڈگر ایک ہو جائیں گے
میرا آدرش جب مجھ کو اپنائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
میری مدفون مٹی پہ روؤ گے تم
کوئی راہی مرا گیت جب گائے گا



جل رہے ہیں نگر
 جل رہے ہیں ڈگر
 پھول مڑھائے
 پات جھڑنے لگے
 یہ گھڑی یہ گھڑی
 کیسی آئی کرپی
 کوئی ساون جھڑی
 کوئی ساون جھڑی!

اے گرج اے کرک
 دے دیوں کو دھڑک
 بادلوں کے دھنی

ہاں پہن لے مری
 آنسوؤں کی لڑی !
 کیسی بنپتا پڑی
 کیسی بیتا پڑی !
 پھول مڑجھا گئے
 پات جھڑنے لگے



میرے دیدہ و رو
میرے دانش و رو!

پاؤں زخمی سہی ڈگگاتے چلو
راہ میں سنگ و آہن کے ٹکراؤ سے
اپنی زنجیر کو جگمگاتے چلو

روکش نیک و بد
نکتے کوتاہ و تند
سر میں بادل لئے
ہیں تہیب کئے
بارش زہر کا
اک نئے قہر کا

میرے دیدہ و رو
 میرے دانش و رو !
 اپنی تحریر سے
 اپنی تقدیر کو
 نقش کرتے چلو
 تھام لو ایک دم
 یہ عصائے قلم
 ایک فرعون کیا لاکھ فرعون ہوں
 ڈوب ہی جائیں گے



اُس کا دام نہ پوچھ اے آمر
اُس کے گیت خرید سکو گے؟

آج تری دہلیز پہ ہر سو
بھک مسگوں کا شور بپا ہے
جو کوڑی کے بھاؤ نہ بکتا
لعل و گوہر کے مول بکا ہے

بارشِ سیمیں تیرا تبسم
کاسۂ رخشاں دستِ گدا ہے
علم و ادب بازارِ کنیزان
حسینِ برہنہ عشوہ نما ہے

دولتِ دانشِ جرأتِ بنیش
فکر کہ فن ہو، سب کی بہا ہے
تیرے دیارِ دام و درم میں
اک شاعر کی قیمت کیا ہے ؟

لیکن تو نے آمرِ ناداں
چاروں اور کبھی دیکھا ہے
سندھ کہ اک دریائے خوں ہے
نبضِ تپانِ دشتِ وفا ہے
اُس کی وادی گریاں میں اب
اک ایسا بھی شعلہ نوا ہے
جس کی صدائے بانگِ جرس پر
ایک انوکھا رقصِ بپا ہے
زنجیروں میں ناخنِ پا پر
اک طرفہ سارنگِ جتنا ہے

برسمِ تپیدنِ خاک و خوں سے
 اُس نے جب بھی شعر کہا ہے
 دیواروں سے دھول اڑی ہے
 شہرِ سلاسل کا نپ اٹھا ہے
 گیتِ گرجتا نعرہ بن کر
 بستی بستی پھیل گیا ہے
 موہن جو دارو کی دھرتی
 آج لپکتا سا شعلہ ہے
 یہ شعلہ جس رقصِ شرر کی
 ایک تجرّخیز ادا ہے
 اُس کا نام نہ پوچھ اے آمر
 اُس کے گیت خرید سکو گے ؟



(امیر خسرو پنہاری سے)

”تیرا ناؤں ہے“

”کانتی“

”تیرا روپ انوپ ہے“

”میرا رنگ نہ روپ ہے“

”تیری صورت سانولی

تو کیا جانے بانولی

من منڈپ کی آگ ہے

تیری کایا کانتی“

”میرا ناؤں کانتی

میرا بھیس بنارسی

تیری بولی پارسی
 میری بولی پوربی
 اور میں پوجوں مورتی
 تیرا من گھنا گھور، میں
 چندر ماں کی شانتی“

”شتر و سمجھ نہ کانتی
 یہ میرا بھی دیس ہے
 کتنا گہرا گسیرا
 میرے تن کا بھیس ہے
 تیرے میرے گاؤں کا
 اپنا اپنا تھا نولا

لیکن ان کے بیچ میں
 پانی تو ہے ایک سا
 میری اچھی کانتی
 میں تو ہوں ویدانتی



مکھ پر ڈالے کیس ابھاگن دھرتی جب سو جاتی ہے
 کھسرو رونے لگتا ہے
 چندا ہے آکاش پہ یا برہن کی بیا کل چھاتی ہے
 کھسرو رونے لگتا ہے
 پیپل کی ڈالی پر پچھڑی کوئل شور مچاتی ہے
 کھسرو رونے لگتا ہے
 اس دھرتی کے بھاگ نرالے روتے روتے گاتی ہے
 میرے من میں جو کھسرو ہے نین بھگوتا رہتا ہے
 گھر جانے کی بات کرو تو بے بس روتا رہتا ہے



پرتگال کے رہنے والو !
 جوئے خوں میں بہنے والو !
 کل کی بات ہے جب تم نے ٹھٹھ میں آگ لگائی تھی
 اور میرے لب پہ دبائی تھی

تاریخ نے پلٹا کھایا ہے
 مجبوروں کو محکوموں کو
 اس دھرتی کے مظلوموں کو
 آج ایسا غصہ آیا ہے
 وہ میرا بدلہ بھی لیتے ہیں
 انگولا کے رستوں پر
 اور موزمبیق کی گلیوں میں

دھرتی پہ چٹکتی کلیوں میں
 جو سرخ تبسم ملتا ہے
 وہ میرے زخمی ہونٹوں پر
 اب دھیرے دھیرے کھلتا ہے

پرتگال میں رہنے والو!
 جوئے خوں میں بہنے والو!

سندھ کی خون آلودہ صدیوں کو میں جیسے بھول چکا ہوں
 سرخ پھریرے کے نیچے میں تیرے گبرو دیکھ رہا ہوں
 جن نے اپنا خون بہا کر

سامراج کے خونی دھبے دھو ڈالے ہیں
 تخت و تاج کے خونی دھبے دھو ڈالے ہیں
 میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر

اُن کو لالِ سلام کیا ہے
 سندھ دیس کے بھولے بسرے
 یوں میں اک گیت دیا ہے
 سچ کے ساتھی انسانوں میں بُعد نہیں ہے
 اس شعلے کے پروانوں میں بُعد نہیں ہے

پُر تگال کے رہنے والو
 جوئے خوں میں بہنے والو
 کل کی بات ہے جب تم نے ٹھٹھ میں آگ لگائی تھی
 اور میرے لب پہ دُہائی تھی



اپنی ساڑھی کو یوں سمیٹے ہوئے
کار سے وہ اتر کر آئی ہے
جیسے لمس جذام ہو دھرتی

اُس کی جا دو بھری نگاہوں سے
دم بخود ہے ہجوم ناہنجار
موج کی سرخوشی ہے پاؤں میں
اور چہرے پہ ہے کنول کا نکھار

اب کسی بیکری سے یک اٹھائے
اپنے بٹوے کو کھولتی ہے تو
دیکھتی ہے کہ کوئی پاؤں بڑھائے
اپنے ہونٹوں میں ایک ہوک دبائے

اُس سے اپنی رنگہ ملاتا ہے
ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتا ہے

اُس کے آنتوں میں بھوک کی ناگن
اُس کے ہاتھوں سے سر اٹھاتی ہے
کاٹنے کے عظیم جذبے کو
بھیک کے واسطے دے باقی ہے

مسکرا کر وہ اپنے بٹوے سے
اک چوٹی نکال لیتی ہے
اور کہتی ہے، ” یہ چوٹی تو

ہاں مگر اس سے چرس کی گولی
آج تم مت خریدنا بچے ! ”

پھر دے تھپے کا چہرے پر
 ایک سیمیں نقاب ڈالے ہوئے
 وہ دکان دار کو لبھاتی ہے



بہر آج اندھیری گلیوں میں
تم مجھ کو چھوڑ کے جاتی ہو

یوں ہونٹ ترے ہونٹوں سے ملے جس طرح ہوا میں کلیاں ہوں
ہم دونوں رس کے بوبھی تھے منہ جیسے شکر کی ڈلیاں ہوں

ہم اس نیلے آکاش تلے جس وقت ملے پہچان لیا
اس جہنم جہنم کے ناتے کو آنکھوں آنکھوں میں جان لیا

میں ڈھونڈھ رہا تھا جس پایل کو گھر گھر گاؤں گاؤں میں
وہ کیسے چھپ سکتی آنکلی اے پیاری تیرے پاؤں میں

یہ کیسی ترشنا تھی نینوں کے مرگھ اکٹھے کر پائی
اور ساون ساون جھڑیوں میں من موروں کو یوں لے آئی

ہے یوں ہی پیت کی ریت رہی یہ پیت بھی پل کی پیت رہی
 گھور اندھیارے پر جگ مگ کی یہ جیت بھی پل کی جیت رہی
 کیوں نانا توڑ کے جاتی ہو؟

پھر آج اندھیری گلیوں میں
 تم مجھ کو چھوڑ کے جاتی ہو



پریم دوانی میراں روئے
اب تک شام نہ آئے

اُس کو کوئی کیسے بھولے
آنگن آنگن بیلا پھولے
ہاں اک سدھ سنگدھ نہ آئے
سُورج ڈوبا حباے

برہا کوئی بھول ہو جیسے
سناجھ بھٹے گو دھول ہو جیسے
دور کدم پر کوئل کوکے
مٹوا چین نہ پائے

سا نوریا ! میں کب ہاری ہوں
 اب تک تم پر بلہاری ہوں
 پاؤں تو اب تک ناچ رہے ہیں
 نین یوں ہی بھسک آئے

پریم دوانی میراں روئے
 اب تک شام نہ آئے



لوگ کہیں میراں بھٹی با نوری
 ساس کہے کل ناسی رے
 (میراں بائی)

تو کس دھرتی کا باسی رے
 کیا چکور ہے کب آئے گی
 تیری پور نماسی رے !
 تیری کویتا بھٹی با نوری
 لوگ کہیں کل ناسی رے
 کیا دیپ خیلایا جس کی
 جوت بنی جگ۔ داسی رے

کیسی دین ملی ہے تجھ کو
 جنم جنم کی پیاسی رہے
 اپنے من میں ڈوب کے دیکھا
 کیا کعبہ کیا کاسی رہے



ایک دیوالی کہ تیری لو نے دی
 اے مرے خسرو کہ دلی سے کراچی تا بہ ارضِ تاشقند
 پھینکتی ہے روشنی کی اک کند
 اور حصارِ تیرگی کو بے حذر
 پھاند نے لگتے ہیں تیرے ارجمند
 یک زباں ہو کر چراغوں کی لوں
 پوچھتی ہیں اک سوالِ درمند
 ”کب تلک یہ روشنی پر قید و بند“



(لطیف اور خسرو)

دو دیپ جلے

اک جہنماں کے کنٹھے پر

اک سبز ہویاں کے صحرا میں

دونوں میں انوکھی پیت کی لو

دونوں میں انوکھے پھول کھلے

دونوں کو ہواؤں کی زد میں

ہم چھوڑ کے نکلے تھے لیکن

وہ لو نہ بچھی وہ پھول نہ اب تک مڑھائے

اور روشنیوں کی پت چھڑیں

وہ دیپ نہ اب تک کھلائے

ہاں اُن کی روشن خوشبو میں :
 ہم اب تک رستہ ڈھونڈتے ہیں
 جس پیت ڈگر سے بھٹکے تھے
 اُس پیت ڈگر کو لوٹتے ہیں



اِس سمت بھٹائی گلیوں میں
 کل خون میں لَت پَت دیکھا تھا
 اُس سمت بھی اک ہنگامہ تھا
 اک خنجر اُس کے سینے میں
 پیوستہ ہوا، وہ آن گرا
 اور میں نے اپنی جھولی میں
 جب اس کے زخم کو سہلایا
 تو کیا دیکھا وہ خسرو تھا
 اِس سمت بھی میرا گرم لہو
 اُس سمت بھی میرا گرم لہو

کیوں پانی بن کر بہتا ہے ؟
 تاریخ کے خونی سفا کو
 تم کب تک خون بہاؤ گے
 اور کب تک یہ بسراؤ گے ؟
 یہ میری زباں یہ اُن کی زباں
 ہے ایک ہی لوری دونوں کی ماں
 لوری جو خاموش زباں سے
 اس دھرتی کی کوکھ سے نکلے
 نئے جنم کو تکتی ہے



آنے والا کل دیکھو جب سُرخ سویرا ہوگا
 ہم اور خسر و ایک ہی صف میں ساتھ دکھائی دیں گے
 دھرتی ماتا کے بیٹوں کا میل انوکھا ہوگا
 چور اچلے آنے والے کل سے دوڑ پھپھتیں گے

آنے والا کل کہ اٹل ہے جس کی مکرئی کوئی نہیں
 آنے والا کل کہ لہو کے دریاؤں سے گرا ہے
 روکنے والے آنے والا کل تو کہیں ٹھہرا ہی نہیں
 ٹوکنے والے ! جو بھی کہو تم آنے والا آتا ہے

آنے والے! کل کا خسرو ایک چمکتا سورج ہے
 جس کے دیئے کی لومیں اپنے من میں جلانے رکھتا ہوں
 صدیاں بیتیں آنے والے کل کی نرالی سچ دھج ہے
 اپنے سارے گیت اُسی کی بھینٹ چڑھانے رکھتا ہوں

پڙهندڙ نسل . پ ن

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ”اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪ ”لڙهندڙ نسل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:
انڌي ماءُ جڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لڙهندڙ، ڪڙهندڙ، ڪڙهندڙ، پڙهندڙ، چُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪُندڙ، پاڙي، ڪاڻو، ڀاڄوڪڙ، ڪاوڙيل ۽ وڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پر اسان انهن سڀني وچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪڍي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ٺاهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهڻ ۽ هِڪَ ٻئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻڻ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نسل (پڻ) ڪا به تنظيم ناهي. اُن جو ڪو به صدر، عهديدار يا پايو وجهندڙ نه آهي. جيڪڏهن ڪو به شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو ته پڪ ڄاڻو ته اهو ڪوڙو آهي. نه ئي وري پڻ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو ته پڪ ڄاڻو ته اهو به ڪوڙو آهي.

جهڙيءَ طرح وڻن جا پڻ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اهڙيءَ طرح پڙهندڙ نسل وارا پڻ به مختلف آهن ۽ هوندا. اهي ساڳئي ئي وقت اداس ۽ پڙهندڙ، ٻرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وڙهندڙ ۽ پڙهندڙ به ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پڻ ڪا خصوصي ۽ تالي لڳل Exclusive Club نه آهي.

ڪوشش اها هوندي ته پڻ جا سڀ ڪم ڪار سهڪاري ۽ رضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي ته ڪي ڪم اجرتي بنيادن تي به ٿين. اهڙي حالت ۾ پڻ پاڻ هڪٻئي جي مدد ڪرڻ جي اصول هيٺ ڏي وٺ ڪندا ۽ غير تجارتي non-commercial رهندا. پڻن پاران ڪتابن کي ڊجيٽائيز digitize ڪرڻ جي عمل مان ڪو به مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نه ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊجيٽائيز ڪرڻ کان پوءِ اهم مرحلو ورهائڻ distribution جو ٿيندو. اهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو ته ڀلي ڪمائي، رڳو پڻن سان اُن جو ڪو به لاڳاپو نه هوندو.

پڙهندڙ نسل . پڻ The Reading Generation

پَنن کي کليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي ته هو وَس پئاندڙ وڌ
 کان وڌ ڪتاب خريد ڪري ڪتابن جي ليگڱن، ڇپائيندڙن ۽
 ڇاپيندڙن کي همٿائن. پر ساڳئي وقت علم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
 کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪنهن به رُڪاوٽ کي نه مڃن.
 شيخ اياز علم، ڄاڻ، سمجھ ۽ ڏاهپ کي گيت، بيت، سٺ،
 پُڪار سان تشبيهه ڏيندي انهن سڀني کي بمن، گولين ۽ بارود
 جي مد مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو ته:
 گيت به ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪرڻ ٿا.

... ..

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جڳ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇپن ٿا،
 ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي منجهه پهچن ٿا،

... ..

ڪالهه هُيا جي سُرخ گلن جيئن، اڄڪلهه نيلا پيلا آهن؛
 گيت به ڄڻ گوريلا آهن.....

... ..

هي بيت اُٿي، هي بم-گولو،

جيڪي به ڪٽين، جيڪي به ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نه آ، هي بيت به بم جو ساٿي آ،

جنهن رڌ ۾ رات ڪيا راڙا، تنهن هڏ ۽ چم جو ساٿي آ -

ان حساب سان اڻڄاڻائي کي پاڻ تي اهو سوچي مڙهڻ ته

”هاڻي ويڙهه ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نه

وڃايو“ نادانيءَ جي نشاني آهي.

پَنَ جو پڙهڻ عام ڪتابي ڪيڙن وانگر رڳو نصابي ڪتابن تائين محدود نه هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڍي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نسل جا پَنَ سڀني کي **ڇو، ڇا، ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بيان تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جواب ڳولڻ کي نه رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اڻٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان به پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي ان سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون پاڪي پائي چيو ته ”منهنجا پاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ.“
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)

پڙهندڙ نسل . **پ ن** The Reading Generation